

عکس و نقش

(ادبی، تحقیقی، تاثراتی اور معلوماتی مضامین کا مجموعہ)

زماں قاسمی

جملہ حقوق : کریم النساء

کتاب :	عکس و نقش (ادبی، تحقیقی، تاثراتی اور معلوماتی مضامین کا مجموعہ)
مصنف :	زماں قاسمی
پتہ :	کانکی نارہ ہاؤسنگ سوسائٹی، فلیٹ نمبر-بی-۴
	کانکی نارہ، ۲۴/پرگنہ، پن نمبر ۷۴۳۱۲۶
ناشر :	فیروز کوثر
سال اشاعت :	جون ۲۰۰۹ء
تعداد :	۵۰۰ (پانچ سو)
قیمت :	۱۵۰ روپے
کمپوزنگ :	ڈاٹا گرافکس، 51/16، کاویہ گھاٹ روڈ، شیب پور، ہوڑہ-۲
ترتیب و تہذیب :	ہمدن نعمانی 42/1، انور بگن، کمرہٹی، کولکاتا-۵۸
زیر اہتمام :	ادارہ قرطاس و قلم (کانکی نارہ و جگندل)

AKS-O-NAQSH

by

ZAMAN QUASMI

انتساب

والدہ مرحومہ
زیتون بی بی
کے نام
جن کی نرم فہمائش
زندگی کی کڑی دھوپ میں
گھنی چھاؤں ثابت ہوئی

فہرست

۶	عرض مصنف
۷	نقشِ دوام ڈاکٹر شاہ اختر
۹	زماں قاسمی کی ادبی بساط کلیم حاذق
	عکس و نقش
۱۲	رنگارنگ موضوعات اور فنی ہنرمندی کی ایک مثال نذیر احمد یوسفی
۱۵	صاحبِ عکس و نقش ہمدن نعمانی

عکسِ دواں

۱۷	کانکی نارہ وجگندل کی علمی و ادبی تاریخ
۲۷	کانکی نارہ وجگندل کا ادبی منظر نامہ - آزادی کے بعد

نقشِ زماں

۴۳	منظفر حنفی - ”یا انھی“ کے آئینے میں
۴۹	صابراقبال - ایک ہمہ جہت فنکار
۵۴	قیوم بدر - طنز و مزاح کا ایک منفرد نام

اوراقِ رفتگاں

۵۸	ظلِ سرسید - حکیم عبدالقادر
۶۳	حافظ علی حسین - ایک امام، ایک استاد، ایک طالب علم
۶۶	عبدالرزاق شاکی - کانکی نارہ کی ایک اہم ادبی شخصیت
۷۰	وحید عرشی - بحیثیت نثر نگار
۷۵	خلش امتیازی - کچھ یادیں، کچھ آنسو
۸۰	صابر وارثی - یادوں کے جھروکے سے
۸۴	جمیل الہ آبادی - کچھ یادیں

۸۷

سراج عرشی - ایک البیلا شاعر

۹۰

بشیر الدین ظامی - ایک تاثر

اوراقِ نہاں

۹۵

مومن خاں مومن اور شطرنج

۹۹

شطرنج اور اردو شاعری

۱۰۵

چونسٹھ خانوں اور بتیس مہروں کا کھیل

۱۱۰

ہندوستان میں شطرنج کے چند مسلم کھلاڑی

۱۱۳

ایک آل انڈیا مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال

۱۲۱

مغربی بنگال کا پہلا طرحی مزاحیہ مشاعرہ

۱۲۶

حواشی

عرضِ مصنف

”عکس و نقش“ میرے تاثراتی، تحقیقی اور ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ۲۰۰۱ء میں ایک شعری مجموعہ ”ریت اڑتی رہی“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ نثر کے میدان میں یہ میری پہلی کاوش ہے۔ آخری اس لیے نہیں کہوں گا کہ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے بلکہ بینک کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اب یہی ایک جنون ہے جو زندگی کے ساتھ جڑ کر رہ گیا ہے۔ میری یہ کاوش کیسی ہے اس کا انحصار ادب کے قارئین کی آراء پر ہے۔ مختلف اوقات میں لکھے گئے ان مضامین کو کتابی شکل میں یکجا کرنے کا مقصد ان کو زمانے کے دست برد سے محفوظ کرنا تھا تا کہ مستقبل میں اس علاقے سے متعلق تحقیق و جستجو کرنے والوں کو کسی حد تک روشنی مل سکے۔ میری یہ کاوش کہاں تک کامیاب ہے، کتاب آپ کے سامنے ہے اور فیصلہ آپ کے ہاتھ میں۔

میری علمی و ادبی زندگی کی آرائش میں جن شخصیتوں کا ہاتھ رہا ہے ان کے تئیں عقیدت کا جذبہ ابھرنا ایک فطری امر ہے۔ اس جذبے کو تحریری شکل میں پیش کرنا میرا اخلاقی فرض بھی تھا اور دیانت داری کا تقاضہ بھی، سو چند مضامین اسی جذبے کی مرہونِ منت ہیں۔

اس کتاب میں کچھ مضامین شطرنج کے تعلق سے ہیں جو یقیناً اردو قارئین کے لیے لطفِ نو کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ماضی میں شطرنج سے میرا الہانہ تعلق رہا ہے اور آج بھی ہے چنانچہ ادب کی طرف مائل ہونے کے باوجود شطرنج سے یکسر قطع تعلق نہ کر سکا اور یہ موضوع ہمیشہ ذہن کے دروازے پر دستک دیتا رہا۔ نتیجے کے طور پر کچھ معلوماتی اور تحقیقی مضامین نوکِ قلم سے صفحہ قرطاس پر آ گئے۔

میں شکر گزار ہوں جناب حشم الرضوان اور ڈاکٹر شاہد اختر کا جنھوں نے مجھے نثر لکھنے کی ہمیشہ تر غیب دی۔ احسان مند ہوں ”قرطاس و قلم“ کے جملہ اراکین (صابر اقبال، خورشید اقبال، احمد کمال ششمی، ارشد جمال ششمی، بلند اقبال اور عظیم انصاری) کا جنھوں نے ادارہ کی ماہانہ نشستوں میں میرے مضامین کو سراہا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

برادرِ مہر شمیم بھی میرے شکرے کے مستحق ہیں جنھوں نے کمپوزنگ سے پریس تک کے سارے معاملات سنبھالے اور مجھے ڈھیروں پریشانیوں سے بچالیا۔

نانا انصافی ہوگی اگر میں جناب واقف رزاقی، سرفراز احمد، مولوی محمد یلین، محمد اسحاق خاں، ماسٹر جمال (کیلا بگان)، صابر اقبال، قیوم بدر اور ہمد نعمانی کا شکریہ نہ ادا کروں جن کی وساطت سے بعض مضامین کی تیاری میں اہم معلومات ہاتھ لگے۔

زماں قاسمی

نقشِ دوام

بعض لوگوں سے متعلق کثیر الجہات کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ میں اسے مبالغے پر محمول کرتا رہا ہوں اس لیے کہ میری ایک عمر کسی ایک جہت کی تلاش میں لگ گئی اور ایک عرصہ تک میرا حال بقول غالب یہ رہا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

لیکن اپنے سابقہ خیال پر قائم نہیں رہ سکا۔ میرے مطالعے میں بعض ایسی شخصیتیں آئیں جن کی مختلف جہتوں میں پیش رفتی حیران کن ثابت ہوئی اور اس لفظ کثیر الجہات پر مبالغہ آرائی کا میرا اعتراض تقریباً جاتا رہا۔ یہ اور بات تھی کہ پھر بھی میں ذاتی طور پر کسی ایسے شخص سے متعارف نہیں ہو سکا جو کثیر الجہات ہو۔ استاذی مرحوم پروفیسر جاوید نہال جو مختلف خانوں میں منقسم تھے، یہ لفظ ان پر بھی چسپاں نہیں ہو سکا تھا اس لیے کہ نثر میں ان کے قلم کا گھوڑا سر پٹ بھاگتا تھا مگر شاعری کی دلدلی زمین سے کوسوں دور رہتا تھا۔ لیکن خدا خدا کر کے گزشتہ صدی کے آخری برسوں میں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی گئی، ابتدائی تعارفی کلمات میں ہی جس نے مجھے چونکا دیا۔ سائنس کا گریجویٹ، بینک کی ملازمت، اردو کا ایم اے، شطرنج کا کھلاڑی، شاعر، نکتہ داں، نکتہ رس۔ میں نے کہا بھئی کوئی میدان ہم جیسے سست رفتاروں کے لیے بھی چھوڑ دو۔ اس وقت تک چپ رہا۔ پھر جواب اس طرح دیا کہ ہر دوسرے تیسرے ہفتے اس کے نثری مضامین اشاعت پذیر ہونے لگے۔

سچ پوچھیے تو مغربی بنگال کی نثر نگاری پر ایسا کر کے اس نے بڑا احسان کر دیا۔ یوں تو سالک لکھنوی کی نثری تاریخ میں ناموں کی لمبی چوڑی فہرست مل جائے گی مگر ان میں سے چند ہی ایسے ہیں جنہوں نے واقعتاً اردو نثر کی خدمت کی ہو۔ بعض بدنصیب خدمت گزاروں کو اس فہرست میں جگہ ہی نہیں مل سکی۔ خیر!

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں داند

شاعر زماں قاسمی کو نثار زماں قاسمی نے تقریباً مات دے دی۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی

بیچے صاحب دیکھتے دیکھتے مضامین کے انبار لگ گئے اور اب عکس و نقشب کی صورت میں ان کا انتخاب بھی چھپنے کو تیار ہے۔ اب بھلا کیسے یہ بات دعوے کے ساتھ نہ کہی جائے کہ زماں قاسمی ایک کثیر الجہات شخص کا نام ہے۔

عکس و نقشب کل بیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ چھ تحقیقی مضامین، مومن خاں مومن اور شطرنج، شطرنج اور اردو شاعری، چونسٹھ خانوں اور بتیس مہروں کا کھیل، ہندوستان میں شطرنج کے چند مسلم کھلاڑی، کانکی نارہ اور جگتدل کی عملی و ادبی تاریخ اور کانکی نارہ کا ادبی منظر نامہ، چار تنقیدی مضامین:۔ مظفر خفی۔ یا انی کے آئینے میں، وحید عرشی بحیثیت نثر نگار، قیوم بدر: طنز و مزاح کا منفرد نام اور صابر اقبال: ایک ہمہ جہت فنکار، دور پورتا اور آٹھ شخصیات کے عکس و نقشب کے نقش کو

دوامی بنانے کے لیے کافی ہیں۔ تحقیقی مضامین میں جس ژرف نگاہی کا ثبوت دیا گیا ہے، وہ بنگال کی اردو تحقیق میں بلاشبہ اہم اضافہ ہے۔ تنقیدی مضامین پر تاثرات حاوی ہیں باوجود اس کے فن اور فن کار کو سمجھنے کی غیر جانب دارانہ کوششوں کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔

رپورتاژ کی رنگیں بیانی اور جزئیات نگاری مناظر کو از سر نو تازگی بخشتی ہیں۔ خاکے ان افراد کے ہیں جنہوں نے ادب اور معاشرت کی بے لوث خدمت میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ یہ خاکے ان حضرات کو خراج عقیدت و محبت بھی ہیں اور خاکہ نگاری کی صنف کو مستحکم بھی کرتے ہیں۔

زماں قاسمی کی نثر سادگی و پرکاری کی منہ بولتی تصویر ہے۔ وہ بے تکلف نثر لکھتے ہیں اس لیے ان کی تحریر میں عبارت آرائی کی تلاش سعی لا حاصل ہے۔ عکس نقش جس سفر کی ابتدا ہے اس کی انتہا بنگال کی اردو نثر نگاری کا تابناک مستقبل ہے۔

ڈاکٹر شاہد اختر

(ہیڈ پوسٹ گریجویٹ، ڈپارٹمنٹ آف اردو، ہنگلی محسن کالج)

۱۲ جنوری ۲۰۰۹

زماں قاسمی کی ادبی بساط

یہ امر لائق تحسین ہے کہ اردو زبان کے دلدادگان اپنی زبان اور ثقافت، اپنی علمی اور ادبی تاریخ کو جاننے اور پہچاننے کی کوششوں میں انتہائی عرق ریزی سے اُن عوامل پر غور کر رہے ہیں جن کی تکمیل سے زبان و ادب کا موجودہ ناک نقشہ تیار ہوا ہے۔ اس ضمن میں اُن تمام جزئیات کو موضوع بحث بنانے اور اُن تمام علاقوں کی ادبی اور لسانی سرگرمیوں کا احاطہ کیا جا رہا ہے جو اب تک پردہ خفائیں رہی ہیں یا ان پر کم باتیں ہوئی ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم اپنی زبان اور اس کے ادب کی پھیلتی جڑوں کی شناخت کر سکیں گے ورنہ اب تک یہی ہوتا ہے کہ اردو زبان کے حوالے سے کچھ مرکزی علاقوں کی ادبی سرگرمیوں کو اس زبان کے ادب کا حاصل سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اس کی اصل وسعتوں کو کبھی بھی منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ جب ان مراکز پر اردو زبان و ادب کی سرگرمی میں تخفیف ہونے لگی تو اُسے مردہ زبان کہنے پر یار لوگ کمر بستہ ہو گئے ہیں لیکن زبان کے اصل محافظ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ زبان کی حفاظت کا مطلب یہی ہے کہ اُسے اپنی ثقافت، علمی اور ادبی سرگرمیوں میں وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔

جناب زماں قاسمی نے بھی انہیں عوامل کا تجزیہ کرنے، کچھ بھولی بسری ادبی شخصیات کے نام اور کام سے اُردو دنیا کو متعارف کرنے کے ساتھ کچھ نامور تخلیق کاروں کی کاوشوں پر اپنی نئی تلی رائے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ زماں قاسمی کا تعلق کلکتے سے متصل مغربی بنگال کے ایک مردم خیز علاقہ کانکی نارہ سے ہے۔ ان دنوں جب مرکزی کلکتہ تقریباً خالی ہو چکا ہے کلکتے کے نواح میں پھیلی بستیاں اردو کے اہم مراکز میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ کانکی نارہ، شمالی ۲۴ پرگنہ کا ایک ایسا علاقہ ہے جس کی اردو زبان و ادب کی خدمات آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی اہل نظر کے نزدیک قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس ضلع کی اہمیت یوں بھی رہی ہے کہ غیر منقسم مشرقی ہند کے دو اہم مراکز کلکتہ اور ڈھاکہ کے درمیان عام گزرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ زیادہ تر جوٹ ملیں کلکتے سے قریب ہلکی ندی کے دونوں کناروں پر آباد تھیں اور موجودہ بنگلہ دیش جو پہلے مشرقی پاکستان تھا، اپنی زرخیز زمینوں کے ساتھ چمکدار جوٹ اور ڈھاکہ کی لمبل کے لئے بے حد مشہور تھا۔ اردو والوں کے لئے یہ سب کچھ گھر آنگن کے طور پر تھا۔ یہاں کی جوٹ ملوں میں بہار اور یوپی کے اردو ہندی بولنے والے مزدوروں کی کثرت تھی۔ اسی طرح یہ علاقے نہ صرف آباد ہوئے بلکہ ادبی سرگرمیوں کی آماجگاہ بھی بن گئے۔ کلکتہ سے متصل کمرہٹی، ٹیٹا گڑھ، شیام نگر، جکتدل، کانکی نارہ تک اردو ہندی بولنے والوں کی ایک پٹی تیار ہو گئی اور اردو زبان و ادب کا چرچا ہونے لگا جس میں مرکزیت مشاعرے کو حاصل تھی۔ آزادی کے بعد اس منظر نامے میں تبدیلی آئی۔ آبادی کی منتقلی کے نام پر غیر منقسم بنگال کے لوگوں پر جو آفت آئی، اس کے نتیجے میں یہ علاقے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ آبادی جو لسانی قربت کے باعث یوپی اور بہار کو خیر باد کہہ کر یہاں آباد ہوئی تھی اور ایک ہی اسکول میں دونوں زبان کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے، اُن پر قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی۔ جب حالات معمول پر آئے تو زندگی کا منظر نامہ بدل چکا تھا۔ اس کے باوجود آج بھی کارخانے کی وسل انہیں جوڑے ہوئے ہے تاہم

اس خطے میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی ایسی اہم شخصیات پیدا ہوئی ہیں جن میں سے کچھ اتنے فعال اور سرگرم تھے جن سے نہ صرف آس پاس کے علاقے فیضیاب ہوئے بلکہ ان کی علمیت اور ادبی و تخلیقی استعداد کی گونج مغربی بنگال کی سطح پر اور بنگال سے باہر بھی سنی جاتی رہی ہے۔

زماں قاسمی کی زیر نظر کتاب میں کچھ اسی نوعیت کے احساس کی کارفرمائی ہے۔ اُن کی دلچسپیاں بھی دیگر فنکاروں سے منفرد ہیں۔ شطرنج سے شغف نے انہیں مومن سے جوڑ دیا ہے لہذا وہ اس حوالے سے بھی اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اولین مضمون میں کانکی نارہ کی تاریخ اور ادبی سرگرمیوں کے ابتدائی نقوش تلاش کرنے کی کوشش ہے جن کی تفصیلات سے اردو کا عام قاری روشناس نہیں ہے۔ اُس دور میں مشاعرہ ہی اردو زبان کے فروغ کا ذریعہ رہا ہے۔ آزادی کے بعد کانکی نارہ کی سماجی، علمی اور ادبی زندگی میں نامساعد حالات کے باوجود کافی نکھار پیدا ہوا ہے۔ زماں قاسمی نے اپنے مضمون میں ان سرگرمیوں کا بطور احسن ذکر کیا ہے۔ ایسی ایسی ادبی شخصیات، رسائل و جرائد اور کتابوں کا ذکر ہے جو بنگال کی اردو تاریخ ادب پر کام کرنے والوں کے لئے حوالے فراہم کرے گا۔ چار ابواب پر مشتمل اس کتاب میں کافی مفید اور حوصلہ افزا باتیں موجود ہیں جن کے حوالے سے انسان نامساعد حالات کو موافق بنا سکتا ہے۔ کچھ ایسی ادبی شخصیات پر تفصیلی مضامین سپرد قلم کئے گئے جنہیں اردو کے قارئین پسند فرمائیں گے۔ زماں قاسمی کے مضامین دراصل اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت سے ہم آہنگ ہیں جسے آج کے فلسفیانہ رنگ و آہنگ نے معدوم کر رکھا ہے۔ اطلاعاتی انداز بیان کے باوجود زماں کے مضامین میں ایک طرح کی چاشنی، ادبیت نیز تنقیدی اور تحقیقی شعور کی جلوہ گری ہے۔ ان کی زبان شستہ اور رواں ہے۔ کہیں کہیں انشا کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ بنگال کے ایک ناول نگار بشیر الدین خامی کے تعلق سے کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

”بنگال میں ناول نگاروں کی تعداد ہمیشہ اچھی خاصی رہی ہے جیسے بنکم چندر چٹرجی، سمریش باسو، تارا شنکر بنرجی، سرت چندر چٹرجی، امیہ سانیال وغیرہ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی بنگال کے اردو ادب میں ناول نگاروں کی تعداد انتہائی کم رہی ہے۔ ایسے عالم میں بشیر الدین خامی کا ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھنا تعجب کی بات تھی۔ ان کی مادری زبان اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ بھی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ بنگلہ ادب کا انھوں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو اور بنگلہ ادیبوں کے گہرے اثرات انھوں نے قبول کیے ہوں۔ کہیں نہ کہیں بنگلہ ادب اور اردو ادب کے بیچ کوئی نکتہ اتصال ضرور رہا ہے۔ جب انھوں نے اپنا پہلا ناول ”بھنور“ لکھا تو پیشتر لوگوں کو حیرت ہوئی۔ تین برسوں کے بعد ۱۹۷۸ء میں جب ان کا دوسرا ناول ”نئی زندگی“ چھپ کر عوام کے سامنے آیا تو لوگ ان کی ناول نگاری کے قائل ہو گئے۔“

اس کتاب میں جہاں مظفر حنفی، صابراقبال اور قیوم بدر جیسے مختلف اصناف کے فنکاروں پر مضامین ”عکسِ زماں“ کے عنوان سے جیلۂ تحریر میں لائے گئے ہیں، وہیں وحید عرشی، جمیل الہ آبادی، خلش امتیازی جیسے ممتاز شعرا پر مضامین کچھ پرانے لیکن اچھے دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ شطرنج، اردو ادب اور مومن زماں قاسمی کی افتادِ طبع کا مظہر ہے۔ اردو میں اس طرز کے مضامین خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ زماں قاسمی خوش فکر شاعر کی حیثیت سے متعارف تو تھے ہی، یہ کتاب انہیں باشعور نثر نگار کی حیثیت سے بھی مقبولیت عطا کرے گی۔ مجھے امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

عکس و نقش

رنگارنگ موضوعات اور فنی ہنرمندی کی ایک مثال

تقریباً چھ مہینے قبل جناب زماں قاسمی سے ان کے دولت کدے پر تعارف کا شرف حاصل ہوا۔ رسائل و جرائد کے توسط سے ان کی شعری تخلیق مطالعے میں تھیں۔ ان سے ملنے اور قریب سے دیکھنے کا اشتیاق برسوں سے تھا۔ ملاقات ہوئی تو ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔

ملاقات میں انھوں نے اپنا اولین شعری مجموعہ (اشاعت ۲۰۰۱ء) ”ریت اڑتی رہی“ کی ایک جلد بھی نذر کی۔ بلامبالغہ عرض ہے کہ زماں صاحب کھلی نگاہ کے شاعر ہیں، لب و لہجہ نیا نیا سا ہے، فکر و احساس کی ترسیل میں نئی جہت کی تلاش ہے، کچھ نیا کہنے کی بیتابی ان کے شعری رجحان کی روشن خوبی ہے۔ ان کی شاعری مکمل طور پر متنوع اور سوچ کی شاعری ہے۔ اپنی بات کہنے اور شعری حسن کو دائم و قائم رکھنے کے لیے جو بھی الفاظ استعمال کرتے ہیں، وہ خوبیوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں زندہ دلی ہے، ناکامی، نامرادی، قنوطیت اور پشیمانی کے جذبہ اظہار سے کافی حد تک کنارے ہیں۔ دراصل انھوں نے اپنی شاعری میں حیات انسانی کے مختلف شعبوں کے تعمیری پہلوؤں پر نظر رکھی ہے اور اسی سے اپنی شاعری کی نئی دنیا تشکیل کرتے ہیں۔ مایوس اور دل گرفتہ دل و دماغ میں زندہ روح پھونکنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کی یہ روشن خوبی انھیں شعری دنیا میں انفرادیت، اہمیت اور آفاقیت بخشتی ہے۔

زماں قاسمی کا نام اردو ادب کے افق پر کئی دہائیوں سے اپنی شہرت کی کرنیں بکھیر رہا ہے۔ بنگال کی شعری دنیا میں ان کا نام اور ان کی ہمہ رنگ شخصیت مقبولیت کا آسمان چھو رہی ہے۔ کئی مقامی ادبی و تعلیمی ادارے ان کے نام و کام سے روشن ہیں اور اپنی تقریبات خاص کی فہرست میں ان کی شمولیت کو از حد ضروری اور اہم سمجھتے ہیں۔

شعری مجموعہ کے بعد اب وہ مضامین کا مجموعہ ”عکس و نقش“ ادب کے منظر نامے پر پوری آب و تاب کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ ادبی، تحقیقی، تاثراتی اور معلوماتی مضامین کے اس مجموعے میں زماں صاحب نے اپنی تخلیقی صلاحیت کو انفرادیت عطا کرنے کے لیے کچھ شعوری کوشش، کچھ تجربات، کچھ رائج رجحانات، کچھ استدلال کا استعمال موزوں اور مناسب طور پر کیا ہے۔ مضامین کی افادیت رنگارنگ موضوعات کی بناء پر بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ مضامین ان کی سخت محنت، جستجو اور عرق ریزی کی ہی غمازی نہیں کرتے بلکہ ان کی فنی ہنرمندی کے بھی عکاس ہیں جس سے ایک خاص تاثر دل و دماغ پر نقش ہوتا ہے۔

”عکس و نقش“ میں مختلف عنوانات کے تحت ۷۱ مضامین ہیں جنہیں چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عکس رواں کے نام سے انھوں نے اپنے علاقے کے دو خاص اردو مراکز کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ جگتدل اور کانکی نارہ میں آزادی کے بعد علمی و ادبی ترقیات کا جائزہ اور اردو، اردو ادب اور اردو قلم کاروں کی تخلیقی مشغولیات کا بیان بھی ہے جس سے وہاں کے ادبی

حالات کو کوائف سے روشناسی ہوتی ہے۔ اس دور افتادہ علاقے میں جن فنکاروں نے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا اور اردو کی ادبی تحریکوں میں شب و روز صرف کیے، ان کا ذکر نہایت محبت سے کیا ہے اور ان کی سعیِ بلیغ کی دل کھول کر تعریفیں کی ہیں اور ان کی داخلی صفات کو لفظوں کی روشنی بخشی ہے۔ 'نقشِ زماں' کے زیر عنوان نامور شاعر، نقاد و محقق مظفر حنفی کی دسویں شعری کتاب 'یا انی' کے شعری محاسن کا مطالعہ ہے اور صابر اقبال اور قیوم بدر کی تخلیقی ہنرمندی اور نثری و شعری خوبیوں کا جائزہ ہے۔

'اوراقِ رفتگاں' میں ظلِ سرسید، حکیم عبدالقادر، حافظ علی حسین، عبدالرزاق شاکی، وحید عرشی، خلش امتیازی، صابر وارثی، جمیل الہ آبادی، سراج عرشی اور بشیر الدین غامی جیسے علاقائی صاحبانِ علم و فن، اسلامی فکر، دینی حمیت، ملی غیرت کے امین و رہنما، اردو شعر و ادب پاسباں، علمی، ادبی، تہذیبی، سیاسی و ملی تحریکوں اور قومی، اصلاحی، تعلیمی اور ثقافتی تنظیموں سے لگے جڑے دانشورانِ قوم و ملت کے فکر و عمل اور خیالات و رجحانات کا پُر مغز تجزیہ ہے۔

'اوراقِ نہاں' میں مومن خان مومن اور شطرنج، شطرنج اور اردو شاعری، چونسٹھ خانوں اور بتیس مہروں کا کھیل، ہندوستان میں شطرنج کے چند مسلم کھلاڑی، ایک آل انڈیا مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال اور مغربی بنگال کا پہلا طرچی مزاحیہ مشاعرہ نام کے تحقیقی و تاثراتی مضامین ہیں۔ فکرو فن کے مختلف اور متنوع پہلوؤں پر زماں قاسمی کی نگاہ دور رس اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ تحقیق و تنقید کے کٹھن کام سے ان کا شوق، دلچسپی اور فریفتگی، روشن اور مثبت ہے۔ خوب سے خوب تر موضوع کی جستجو، تحریر کی خود اعتمادی، زبان و بیان کا چچا تلا انداز ان کے تخلیقی شعور کو ہمیز کرتے ہیں۔ ادبی ڈگر سے ہٹ کر انھوں نے جو شطرنج جیسے دماغ نچوڑنے والے کھیل کی تاریخ لکھی ہے، وہ داد و تحسین سمیٹنے کے لیے کافی ہے۔

زماں قاسمی نے اپنے مضامین کی تیاری میں مقامی فن کاروں اور فن پاروں پر اپنی گہری سوچ اور فکری تازگی کو مرکزیت بخشی ہے اور اپنے ارد گرد کے ہونے والے ادبی و شعری تجربوں، تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں اور جیتے جاگتے کرداروں کی تفصیلات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر فنی پیکر عطا کیا ہے۔ ترشے تر اشے، قیمتی موتیوں جیسے آبدار الفاظ کی مدد سے جن صاحبانِ قلم کا جائزہ پیش کیا ہے، ان کے فن، ہنر، شخص و عکس کے تمام حقائق دل پذیر تصاویر کی طرح صفحے پر اتار کر رکھ دیا ہے۔ یہ کامرانی انھیں یونہی نہیں ملی۔ یقیناً یہ بہترین صلاحیت قدرت نے انھیں ودیعت کی ہے۔

'عکس و نقش' کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہوئے اس امید کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے مضامین کا آئندہ مجموعہ ان علمی و ادبی لعل و گہر شخصیتوں پر ہوگا جو عالمی شہرت کے حامل ہیں۔

نذیر احمد یوسفی

۱۴ جنوری ۲۰۰۹ء

صاحبِ عکس و نقش

کچھڑی ہوتے ہوئے بال، تجربے کی بین مثال، روشن پیشانی جیسے تجسس کی گل افشانی، رنگت سرخی مائل جس میں سفیدی بھی حائل، ستواں ناک، لہجے سے بے باک۔ چہرہ بدرمیر، رفتار بے نظیر۔ آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ، عمیق مطالعے کا سرچشمہ۔ اپنی دھن میں مگن، بس کام کرتے رہنے کی لگن۔ لاگ و لپیٹ سے کوسوں دور، حلقہ احباب میں مصلح الخیر سے مشہور۔ فطرت میں خوئے وفاداری، وضع قطع میں خلوص و انکساری، آپ ہیں محمد قمر الزماں انصاری، تخلص زماں یعنی افق ادب کے نقش رواں۔

تلاشِ رزق میں دادا محترم عبدالحمید مرحوم نے بلیا (یوپی) سے ہجرت کی اور کانکی نارہ کے جوٹ ملز میں مشقت کی بعد ازاں اچھی کارکردگی کی بناء پر سرداری ملی، یوں کہیے کہ صلہ وفاداری ملی۔ والد محترم محمد قاسم مرحوم محکمہ دفاع کے عازم ہوئے اور اچھا پور رائل فیکٹری میں ملازم ہوئے۔ ۴ مئی ۱۹۴۸ء کو کانکی نارہ میں پیدا ہوئے۔ والدین رحمت الہی کے شیدا ہوئے۔ ادبی نام زماں قاسمی رکھا، والد سے رشقہ دائی رکھا۔ سائنس گریجویٹ ہونے کے بعد درس و تدریس سے کیریئر کا آغاز مگر نشانہ اونچی پرواز۔ مقابلہ جاتی امتحانات کا سر میں سودا سہا، ۱۹۷۳ء میں سنٹر بینک آف انڈیا میں خدمت کا موقع راس آیا۔ ۲۰۰۸ء میں سی ٹی او کے عہدے سے سبکدوش ہوئے بعد ازاں اور پُر جوش ہوئے۔ فکر مہیز ہو گئی، اہب قلم کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔

۱۹۸۱ء میں ایم اے اردو کے امتحان میں نمایاں کامیابی سے دشتِ ادب کی خاک چھانے کا شوق پیدا ہوا، نتیجہ ”میں نے روزہ رکھا“ کی شکل میں اخبار مشرق میں ہویدا ہوا۔ شعر گوئی میں بھی طبع آزمائی کی، استاد محترم حضرت حشم الرمضان نے رہنمائی کی۔ اخبارات و رسائل میں چھپنے لگے، اب شاعر بھی لگنے لگے۔ ۲۰۰۸ء میں شعری مجموعہ ”ریت اڑتی رہی“ منصہ شہود پر آیا، ارباب نقد و ادب سے سند اعتبار پایا۔ اعزاز افضل کی رہنمائی میں کولکاتائیونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن کرا لیا یعنی ادبی ڈاکٹر بننے کا بیڑا اٹھالیا۔ تلاش و تحقیق اور تنگ و دو کے ذریعہ ٹھیسس میں رنگ بھر دیا مگر شعبہ اردو کی چپقلش نے اسی موضوع پر دوسرے کو ڈاکٹر کر دیا۔ شطرنج سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے کیونکہ یہ ذہانت کا رکھ رکھاؤ ہے۔ سنٹرل بینک آف انڈیا ایسٹرن ریجن شطرنج کے مقابلے میں حریف کو شہ مات دے کر چمپئن ہونے کا اعزاز حاصل ہے بقول راوی یہ زیرک مندی کامل ہے۔

علاقے کے بزرگانِ ادب میں حشم الرمضان اور واقف رزاقی کو قبلہ و کعبہ جانتے ہیں اور ان کے ارشادات کو رہنما مانتے ہیں۔ صابر اقبال کی صلاحیتوں کے قائل ہیں اسی لیے ان کے مشوروں پر مائل ہیں۔ ادبی ادارہ قرطاس و قلم کے بانیوں میں سے ہیں، گویا ادارے کی نشانیوں میں سے ہیں۔ علمی و ادبی اور تہذیبی روایتوں کے امین ہیں اسی لیے آپ کی سرگرمیاں شستہ اور متین ہیں۔ قلم کا سفر جاری ہے۔ آئندہ اور ادب پاروں کی تیاری ہے۔

رودادِ الم ہم سے رقم ہوتی رہے گی تخلیق ادبِ نذر قلم ہوتی رہے گی

ہمد نعمانی

۵ دسمبر ۲۰۰۸

کانکی نارہ وجتدل کی علمی و ادبی تاریخ

مغربی بنگال کی راجدھانی کولکاتا (سابق کلکتہ) سے تقریباً چالیس کیلومیٹر شمال کی جانب واقع کانکی نارہ وجتدل ایسے صنعتی علاقے ہیں جہاں کی اکثریت محنت کش مزدور طبقہ پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود ان کی ادبی و تہذیبی اہمیت مسلم ہے۔ آزادی سے قبل کانکی نارہ وجتدل میں جن ادبی اداروں کے وجود کا سراغ ملتا ہے، ان میں انجمن اصلاح المسلمین، قصر الادب، بزم ادب اور انجمن اتحاد المسلمین کے نام قابل ذکر ہیں۔

انجمن اصلاح المسلمین فوج دار قریشی کی باڑی واقع گلی نمبر ۲، کانکی نارہ، چوبیس پرگنہ میں قائم ہوئی تھی۔ اسی نام سے ایک لائبریری بھی چل رہی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کانکی نارہ کے لوگوں میں پڑھنے کا شوق تھا۔ آگے چل کر یہی شوق شعر و شاعری کی فضا سازگار بنانے میں معاون ثابت ہوا۔ قصر الادب نام کی لائبریری اسٹیشن پارک کے علاقے (تھتہ) میں تھی۔ یہاں ادبی نشستوں کا بھی اہتمام ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں کچھ نثری کتابیں بھی تصنیف کے مراحل سے گزریں۔

۱۹۲۷ء میں اسی کانکی نارہ سے پہلی نثری تخلیق ”شق الا وہام“ جس کے مصنف مولانا ابوالعہد دوست محمد تھے کے نام سے منظر عام پر آئی۔ ۱۹۳۳ء میں ان کی دوسری کتاب ”بزرگوں کی دنیا“ زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس زمانے میں عبدالرزاق سردار تریاق کا شعری مجموعہ ”گلدستہ کلام تریاق“ منصہ شہود پر آیا۔ ”قصائد ماہ صوم“ (عبدالرزاق) کی سنہ تصنیف ۱۹۳۳ء ہے۔ ۱۹۳۲ء میں حاجی محمد اسحاق سردار کا دو شعری مجموعے ”گلدستہ نور وحدت“ اور ”کلام ندیم“ کے نام سے چھپ کر مقبولیت کا باعث بنے۔ یہ تمام تصنیفات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں یہاں علم و ادب کا کافی چرچا تھا۔ کانکی نارہ کی ادبی فضا نہایت سازگار تھی۔ سونے پر سہاگہ کہ اس زمانے میں استاد شاعر اثر ابراہیمی کی آمد کانکی نارہ میں ہوئی۔ شمع کے گرد پروانوں کی بھیڑ امنڈنے لگی۔ ادباء و شعراء کا حلقہ بڑھنے لگا۔ اثر ابراہیمی کے اثر میں جولگ آئے ان میں عبدالرزاق شمسید پوری، حسین بخش ہاتف، علی حسین عجمی، کاشف غازی پوری زیادہ مشہور ہوئے۔ اثر ابراہیمی کے بعد آرزو سہارن پوری کانکی نارہ میں قیام کی غرض سے وارد ہوئے۔ آرزو سہارن پوری سے اکتساب فیض کرنے والوں میں ایم جی مصطفیٰ خلش، عبدالرحمن، عبدالعزیز پیش پیش تھے۔

ایسی سازگار ادبی فضا میں ۳ مئی ۱۹۴۱ء کو کانکی نارہ کی سرزمین پر ہونے والا طرچی مشاعرہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مشاعرہ کانکی نارہ کا نہ صرف یادگار مشاعرہ ثابت ہوا بلکہ اولین مشاعرے کا تاج دار بھی بنا۔ اس یادگار مشاعرے کی صدارت ماسٹر مظہر الحق نے کی تھی۔ مصرع طرح کچھ اس طرح تھا۔

قاتل پکارتا ہے کہ قاتل نہیں ہوں میں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مشاعرے میں شرکت کرنے والوں کے نام سے ادبی دنیا واقف ہو۔ قرب و جوار کے شعراء کے علاوہ کلکتہ اور ہوڑہ کے شعراء کرام بھی شریک محفل ہوئے تھے۔ حکیم محمد شعبان، مبارک حسین خاں ناشاد چھپروی، علی

حسین رنگین غازی پوری، حافظ محمد یحییٰ ناظر۔ سید امجد حیدر، اصغر نوگانی، محمد شمس الدین تبر چھپروی،۔ ان تمام شعراء کا تعلق شام نگر سے تھا۔ عبدالعزیز اجر، فاروق دہلوی، محمد صدیق، عبدالرزاق ثمر سید پوری، محمد حنیف اثر آروی، ایم جی مصطفیٰ خلش۔ ان شعراء کا تعلق کانکی نارہ سے تھا۔ حسین بن ہاتف عرف مفلس پیا۔ چنچل غازی پوری، پیارے شاہ پاگل کریمی جکتدل کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ چھیدی لال اگلر اور محبوب عنادل ہوڑوی بھی شریک محفل تھے۔

ادب کے شیدائیوں کے لیے یہ بات باعثِ دل چسپی ہو سکتی ہے کہ زاہد حسین جو ہر غازی پوری اور سیدناظر الحسینی دونوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسی کانکی نارہ کی بستی سے کیا تھا۔ ان کی جوانی کے حسین لحاظ یہیں گزرے تھے۔ اس مشاعرے میں پڑھی گئی غزلوں کے منتخب اشعار قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش ہیں۔

جاذب نگاہ بانی محفل نہیں ہوں میں
اے دل ہے خوب ان کے مقابل نہیں ہوں میں
محفل میں جان ڈال دی شاکھی نے آتے ہی
کہنے پہ اور کہتے ہیں قابل نہیں ہوں میں
عبدالرزاق شاکھی

لاکھوں تڑپ رہے ہیں تری قتل گاہ میں
تنہا تو تیغ ناز کا بسمل نہیں ہوں میں
کیوں ہو دراز دستِ ہوس زلفِ یار تک
دوں بل میں ہاتھ سانپ کے، جاہل نہیں ہوں میں
عبدالرزاق ثمر

لرزے جو حادثات سے وہ دل نہیں ہوں میں
جو در سے لوٹ جائے وہ سائل نہیں ہوں میں
اے آرزو تو خاک میں مل جا مثالی اشک
اب تجھ کو دل میں رکھنے کے قابل نہیں ہوں میں
محمد حنیف اشہر آروی

اس طرحی مشاعرے کے مکمل اشعار دستیاب نہیں ہو سکے۔ اس کے بعد بھی ادب کی محفلیں اسٹیشن پار قصر الادب کی لائبریری میں جمتی رہی ہیں۔

کبھی تھے ہم کتابِ زندگی پہ قسمت عنوان
ہماری داستاں گم ہے اب اوراقِ پریشاں میں
امتیاز علی چنچل

پہنچ جاتا کسی صورت سے میں اس جانِ عالم تک
یہ ارماں ہے مرے دل کا، یہ حسرت ہے مرے دل کی
حاجی محمد اسحاق سردار ندیم

کب سے پکارتا ہوں میں بابِ قبول پر
لہٰذا اب تو رحمتِ عالم سلام لو
حاجی عبدالرزاق سردار تریاق

محفل سے تیری اٹھ کے جو بیداد گر گئے
ہنستے ہوئے ہم آئے تھے اور چشم تر گئے
حسین بخش ہاتف

یورشِ برق وحشیانہ ہے
چار تنکوں کا آشیانہ ہے
عبدالرحمان فیض نیازی

اس طرح سے جیتے ہیں اہلِ درد دنیا میں
سیکنڈوں خداؤں میں اک مری خودی تنہا
سیدنا ظرالحسینی

نیکوں کے بچ چن لیتے ہیں بدیوں کے پرند
زندگی کے کھیت پر پہرہ لگانا چاہیے
محمد ابراہیم ناشاد

دوشِ عالم پہ بکھر زلفِ پریشاں ہو کر
عرصہ دید میں آ عارضِ تاباں ہو کر
عنایت اللہ انصاری عنایت

نشانِ منزلِ محمود ڈھونڈنے والے
تجسسِ خمِ زلفِ ایاز رہنے دے
ایم جی مصطفیٰ خلش

خون ہوا جاتا ہے دل رنگِ گلستاں دیکھ کر
گل کو خنداں دیکھ کر شبنم کو گریاں دیکھ کر

یہ مختصر اشعار اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ آزادی سے قبل کانکی نارہ کی سرزمین پر ادبی نشستوں/مشاعروں، چاہے وہ طرعی نوعیت کے ہوں یا غیر طرعی، کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ ادبی فضا کو برقرار رکھنے میں شعراء کے ساتھ ساتھ ادبی تنظیموں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فساد کی شکل میں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اسے احاطہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ کانکی نارہ کی بھری پری بستی جو اس وقت کا گنارہ کے نام سے مشہور تھی، اجڑ گئی۔ سماج کا پڑھا لکھا باشعور طبقہ نئی دنیا کی تلاش میں ہندوستان کی سرحد پار کر چکا تھا۔ ادبی محاذ پر سناٹے کا راج تھا۔ جمود کی یہ کیفیت لگ بھگ پندرہ بیس برسوں تک قائم رہی۔ آہستہ آہستہ خوف و ہراس کی دھند چھٹی گئی۔ شعرو شاعری کے نغمے پھر سے فضا میں گونجنے لگے۔

شاید وہ ۲۰-۱۹۷۳ء کا زمانہ تھا۔ خادمانِ ملت (گلی نمبر ۵ کانکی نارہ) نے اردو پرائمری اسکول کے صحن میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا۔ مہمان شاعر مطرب بلیاوی کی غزل سرائی کے دوران کانکی ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

اسی درمیان کچھ تصنیف و تالیف کے منصوبے بنائے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں اسی کانکی نارہ سے ایک ماہ نامہ رسالہ ”رواق“ کے نام سے جاری ہوا جس کے مدیر اعلیٰ ناظر الحسینی تھے۔ پرنٹر پبلشر غلام نبی پاگل (واقف رزاقی کے بڑے بھائی) تھے۔ مالی معاونت شمس الحق (کھساری میاں کے لڑکے) نے کی تھی۔ اس رسالے میں رضیہ سجاد ظہیر کا افسانہ بعنوان ”دہنی کروٹ“ چھپا تھا۔ ناظر الحسینی کی غزل بھی پرچے کی زینت بنی تھی۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس کے صرف تین شمارے منظر عام پر آ سکے۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں جکت دل گلی نمبر ۵ سے ”سماوات“ نامی رسالے کا اجرا ہوا۔ ایڈیٹر سیفی الاعظمی تھے۔ آزاد اسپورنگ کلب (نیا بازار، کانکی نارہ) زیر اہتمام آل انڈیا مشاعرہ (منعقدہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۷ء) بھی کانکی اہمیت کا حامل رہا۔

اس کے بعد ۱۹۷۶ء میں ادبی مرکز (مانک پیر) نے آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کر کے اپنی ادب نوازی کا ثبوت دے دیا تھا۔ نامی گرامی شعراء مدعو کیے گئے تھے۔ رات بھر مشاعرہ چلتا رہا۔ اس مشاعرہ کا انتظام مولوی یسین صاحب کے کاندھوں پر تھا۔ ان کے رفقاء کار میں عبدالمنان، اسحاق خان اور خورشید احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔

۲۵ جولائی ۱۹۸۳ء کو بنگال اسپورنگ کلب (گلی نمبر ۵، ریلوے سائڈنگ) کی جانب سے آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ صدارت حشم الرمضان کی تھی۔ شرکاء میں حضرت ستمی مینائی، ناظم انصاری، ثقلین حیدر، حبیب ہاشمی، شہود عالم آفاقی، محترمہ ریحانہ نواب، منظر بھوپالی، ہری کشور نظر، نظریائی کے علاوہ کچھ مقامی شعراء جیسے معصوم شرقی، نور اقبال، صابر وارثی اور سمیع اللہ قمر بھی موجود تھے۔ نقابت کی ذمہ داری منور رانا بخوبی نبھا رہے تھے۔ رات بھر یہ مشاعرہ چلتا رہا۔ ادبی محفلوں میں کانکی دنوں تک اس مشاعرے کا چرچا رہا۔

گلشنِ اردو ادب (گلی نمبر ۲، کانکی نارہ) نے اپنے پرچم تلے درجنوں مشاعرے کرائے۔ ان میں کچھ کی حیثیت طرعی

تھی، کچھ کی غیر طرچی۔ کچھ تعزیتی نشستوں کا بھی اہتمام ہوا۔ اس ادارہ کے سکریٹری احمد کمال ششمی تھے۔ ۱۶ مئی کو حمایت الغریاء ہائر سکندری اسکول کے صحن میں ہونے والا آل بنگال مشاعرہ اپنی نوعیت کا ایک یادگار مشاعرہ تھا۔ اس ادارہ کی جانب سے دیوار گیر جریہ ”نوبہار“ ہر مہینے شائع ہوا کرتا تھا۔ نوجوان کمیٹی (گلی نمبر ۳، کانکی نارہ) کی جانب سے آل بنگال مشاعرہ (منعقدہ ۱۸/۲۰۰۲ء) بھی اپنی جگہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ چھوٹے موٹے مشاعرے بھی ہوتے رہے۔ دیکھا جائے تو اس محاذ پر مقامی اداروں، ادبی تنظیموں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان سرگرم تنظیموں میں یگ کمیٹی گلی نمبر ۵، مانک پیر ویلفیئر سوسائٹی، اے ون کلب، نیابازار وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

انفرادی سطح پر بھی کچھ باذوق حضرات سامنے آئے۔ ادبی نشستوں کو اسپانسر کیا۔ اس طرح نہ صرف اردو سے اپنی محبت اور دوستی کا ثبوت فراہم کیا بلکہ ادبی فضا کو برقرار رکھنے میں کافی حد تک معاون ثابت ہوئے۔ ان میں عبدالوہاب محسنی، فتیم الدین، فہیم حیدر، خورشید اقبال، صابراقبال، محمد علی صدیقی اور حکیم اشرف علی قابل ذکر ہیں۔

ادبی فضا کو ہمیز کرنے میں لائبریریوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ کانکی نارہ کی قومی لائبریری ہو یا برائی پاڑہ کی بزم نشاط، جکتدل کی سیون اسٹار لائبریری ہو یا عہد ماضی کی اصلاح المسلمین لائبریری، ان سب نے بالواسطہ ادبی سرگرمیوں کو بڑھایا ہے۔ قومی لائبریری ضلع چوئیس پرگنہ کی سب سے بڑی لائبریری تھی۔ اس نے لمبی حیات پائی۔ کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ لائبریری بھی گردش زمانہ کا شکار ہو گئی۔

لائبریری اور مشاعروں کی دنیا سے ہٹ کر کچھ جیالوں نے کانکی نارہ ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس تنظیم نے طلبہ و طالبات کے اندر تعلیمی بیداری اور مقابلہ کا جذبہ پیدا کرنے کی خاطر کوچنگ سنٹر کا اہتمام کیا۔ مقابلہ جاتی امتحانات کرائے۔ انعامات سے نوازا۔ آنے والے دنوں میں یہیں سے کچھ ادب کے دیوانے نکلیں گے اور اپنی جرات رندانہ کا مظاہرہ کریں گے۔ ان کی ادبی حرارت ادب کے گلشن میں رنگارنگ پھول کھلائے گی۔

کانکی نارہ کی طرح جکتدل کا علاقہ بھی کافی مردم خیز رہا ہے۔ یہاں بھی چند ادبی اداروں/تنظیموں کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انجمن اتحاد المسلمین کے نام سے ایک ملی ادارے کا سراغ ملتا ہے۔ اس انجمن کا سب سے اہم کارنامہ یہ رہا کہ اس نے مدرسہ چشمہ رحمت کی بنیاد ڈالی جو فی الحال چشمہ رحمت ہائر سکندری اسکول میں تبدیل ہو چکا ہے اور جکتدل سے متصل علاقوں کی علمی پیاس بجھا رہا ہے۔ یہ انجمن ماضی میں سیرت النبی کے کئی شاندار جلسے اور ادبی محفلیں سجانے کا سہرا اپنے سر باندھ چکی ہے۔ تقسیم وطن کی مارنے جکتدل کے مسلمانوں کو بھی بکھیر کر رکھ دیا۔ اس افراتفری کے عالم میں محمد عمر انصاری جو علاقے میں سکریٹری صاحب کے نام سے موسوم تھے، بادِ موسوم کے جھونکوں سے اس انجمن کو بچائے رکھا۔ (آزادی سے پہلے وہ مسلم لیگ کے سکریٹری بنائے گئے۔ اسی تعلق سے تا عمران کا نام سکریٹری صاحب پڑ گیا۔ اس موقع پر ان کے قریبی رفقا کار کا تعاون ہمیشہ ساتھ رہا۔

انجمن اتحاد المسلمین بھی ایک متحرک انجمن تھی۔ آٹ چلہ بگان میں ایک شاندار مشاعرہ کرانے کا سہرا بھی اس انجمن کے سر بندھتا ہے۔ اس انجمن کے تحت ۶۷-۱۹۶۸ء میں ایک آزاد لائبریری کا قیام بھی عمل میں آیا جس کے بانی ابو محمد انصاری تھے۔ یہ لائبریری آٹھ برسوں تک چلی۔ آزاد لائبریری کے زیر اہتمام کئی چھوٹی موٹی ادبی محفلیں منعقد ہوئیں۔ لائبریری کے علمی و ادبی ماحول نے ابو محمد انصاری کو کیف مشرقی۔ ظفر اللہ خان کو ابو ظفر نعمانی، محمد یوسف (موجودہ صابراقبال کے بڑے بھائی) کو مہر یوسف

اور پروفیسر منصور عالم کو ارشد جمال جیسے خوبصورت قلمی نام عطا کیے۔ ادبی محاذ پر اس لائبریری نے زبردست ادبی خدمات انجام دیں۔ سیون اشار کلب / لائبریری کا قیام بھی جگتدل کے سات پڑھے لکھے، باشعور نوجوانوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ادارے کا نام غیر ادبی ضرور ہے لیکن کام ادبی محفلوں کا انعقاد کرنا ہے۔ اسی ادارہ کی نگرانی میں صدف نامی رسالہ ۱۹۸۵ء میں جاری ہوا جو تین سال تک پابندی سے نکلتا رہا۔

جگتدل کے تعلق سے ایک صوفی شاعر شاہ کبیر الدین احمد کبیر فریدی کا سراغ ملتا ہے جو بیسویں صدی کے بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ ”خم خانہ کبیر مع پیمانہ کبیر“ کے نام سے ان پر ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے جس کے مرتب ڈاکٹر ایم کے بیری (ڈپٹی ڈائریکٹر، محکمہ صحت، بہار سرکار، پٹنہ) ہیں۔ اس تصنیف سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ کبیر الدین کی پیدائش انیسویں صدی کی نویں دہائی میں موضع پوٹا، غازی پور میں ہوئی تھی۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد وہ کیلا بگان جگتدل چلے آئے تھے۔ لگ بھگ پچیس برسوں تک جگتدل میں ان کا قیام رہا۔ باقر علی سردار جو اس وقت اینگلو انڈیا جوٹل میں سرداری کرتے تھے، ان کے توسط سے اس وقت کے بڑے بابو امداد حسین کی سفارش پر ۱۹۰۴ء میں انھیں اسی مل میں ملازمت ملی۔ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے وہ بڑے بابو کے عہدہ تک پہنچے۔

ان کی زندگی کے حالات تفصیل سے خم خانہ کبیر الدین میں درج ہیں۔ شاہ کبیر الدین احمد کبیر نے حمد و نعت کے علاوہ منقبت، سلام، چادر، صندل، سہرا، ٹھمری وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ نمونہ کلام دیکھیے۔

گاتی ہیں کبیر آج غزل وجد میں حوریں
ہے عطر بہشتی کی مہک تیرے سخن میں
دل جگر رکھتے ہیں پتھر کا یہی وہ بت ہیں
کون کہتا ہے حسینوں کو وفا آتی ہے
دل کے لینے کی ادا اب تک انھیں آئی نہیں
اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں
چاند سورج کی نظر اے ماہ رو لگ جائے گی
بام سے اترو پہن کر آسمانی چوڑیاں

آزادی سے قبل جگتدل کی تاریخ کا جائزہ لینے سے ایک ایسے شاعر کا پتہ چلتا ہے جو محفلوں میں کبھی نہیں گئے، خانقاہوں میں رہے۔ یہ تھے ایک دیوانہ شاہ وارثی۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۵ء میں موضع حسن پورہ ضلع سیوان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر بعد میں مدرسہ حمید یہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فیض حاصل کیا۔ خانقاہ پھلواری شریف، پٹنہ سے خاصا ربط رہا۔ ان کا رجحان عارفانہ تھا۔ جگتدل میں تقریباً ۱۵-۲۰ برسوں تک مقیم رہے۔ ان کا انتقال ۱۹۵۷ء میں ہوا اور جگتدل میں دفن کیا گیا۔ ان کا مقبرہ جگتدل شریف کے نام سے آج مرجع خلایق بنا ہوا ہے۔ ان کے چند منتشر کلام کو ان کے لائق پوتے نیاز وارث نے یکجا کر کے پیمانہ عشق کی شکل دی جو ۱۹۸۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے رموز اسرار خودی کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی ایمان و صداقت، عشق و محبت کے جذبات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔

راہ مل جاتی ہے جب راہ نما ملتا ہے
حق کے دلبر ہی سے دلبر کا پتہ ملتا ہے
پوچھیے سچ تو نبی ہی سے خدا ملتا ہے
واقف راہ سے منزل کا پتہ ملتا ہے

اگر دیکھنا معجزہ عشق کا ہے
تو اس جسم و جاں کو جلانا پڑے گا
شمع توحید کی روشن ہے ہر اک محفل میں
میں نے جب ذات کو پروانہ بنا کر دیکھا

رسالہ ”صدف“ کے توسط سے درجنوں ادیب و شاعر مظہر عام پر آئے۔ مثلاً قیوم بدر، خورشید اقبال، صابر اقبال، ارشد جمال شمش، جاوید نہال شمش، زماں قاسمی، خورشید بھارتی، عظیم انصاری وغیرہ۔ آج ۲۸ برسوں بعد بہتوں کی ادبی شناخت، ادبی دنیا میں مستحکم ہو چکی ہے۔ اسی لائبریری کے زیر نگرانی ۱۹۸۷ء میں ایک طرحی مزاحیہ مشاعرے کا اہتمام بھی ہو چکا ہے جو نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان گیر پیمانے پر اولین طرحی مزاحیہ مشاعرہ کہلانے کا مستحق بن چکا ہے۔

المختصر آزادی کے بعد ٹوٹنے والی قیامت کا اثر پندرہ بیس برسوں تک لوگوں کے ذہنوں پر حاوی رہا۔ نئی نسل جوان ہوئی، لکھنے پڑھنے کا جنون طاری ہوا۔ کچھ کر دکھانے کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا۔ نوجوانوں میں ادبی بیداری کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ پہلے تو چھپنے چھپانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ پھر کتابیں مظہر عام پر آنے لگیں۔

کانکی نارہ وجگندل کی خالص ادبی تنظیم ”قرطاس و قلم“ نے اپنی پیدائش (۲۰۰۱ء) کے بعد ہی ادبی سرگرمیوں کا ثبوت دینا شروع کر دیا۔ ہر ماہ پابندی کے ساتھ ادبی نشستیں منعقد ہونے لگیں، کبھی طرحی تو کبھی غیر طرحی۔ ”رحمت منزل“ (عظیم انصاری کا دولت کدہ) ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ قرطاس و قلم نے ادبی دنیا کو کئی فنکار دیے۔ خورشید اقبال نے ماہیا نگاری پر کتاب شائع کر کے انٹرنیٹ کے ذریعہ ادبی دنیا کو ایک حسین تحفہ دیا۔ اردو دوست ڈاٹ کام عالمی سطح پر جگندل کی شہرت کا باعث بنا۔ احمد کمال شمش نے ”سفر مقدر ہے“ تصنیف کی۔ زماں قاسمی ”ریت اڑتی رہی“ کے خالق بنے۔ ان تینوں کا تعلق قرطاس و قلم سے رہا ہے۔ الغرض قرطاس و قلم نے کئی ادیبوں اور شاعروں کو متحرک کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کانکی نارہ وجگندل کی ایک مختصر فہرست (شائع شدہ کتابوں کی) سامنے لائی جائے جس سے یہاں کی ادبی سرگرمیوں کا بہ یک نظر اندازہ ہو سکے۔

سال اشاعت	نام کتاب	نام مصنف / مرتب
۱۹۲۷ء	شق الا وہام	مولانا ابوالعہد دوست محمد
۱۹۳۳ء	بزرگوں کی دنیا	مولانا ابوالعہد دوست محمد
۱۹۳۳ء	گلدستہ کلام تریاق	عبدالرزاق سردار تریاق
۱۹۳۳ء	قصائد ماہ صوم	عبدالرزاق سردار تریاق

حاجی محمد اسحاق سردار	گلدستہ نور وحدت	۱۹۳۴ء
حاجی محمد اسحاق سردار	کلام ندیم	۱۹۳۴ء
مدیر ناظر الحسینی	رونق (رسالہ)	۱۹۵۲ء
سیفی الاعظمی	سماوات (رسالہ)	۱۹۶۰ء
بشیر الدین ظامی	بھنور (ناول)	۱۹۷۵ء
ترتیب: زار غازی پوری	صدائے العطش	۱۹۷۶ء
ارمان شام نگری		
مرتبین: وحید عرشی	غزل کی رات (مجلہ)	۱۹۷۷ء
وفا سکندر پوری		
بشیر الدین ظامی		
بشیر الدین ظامی	نئی زندگی (ناول)	۱۹۷۸ء
پروفیسر مجیب الحق	العربیہ	۱۹۷۸ء
ایڈیٹر: مختار الحق	صدائے احباب (مجلہ)	۱۹۸۰ء
ایڈیٹر: قیوم بدر	صدف (رسالہ)	۱۹۸۵ء
ایڈیٹر: قیوم بدر	صدف (رسالہ)	۱۹۸۶ء
ایڈیٹر: قیوم بدر	صدف (رسالہ)	۱۹۸۷ء
مرتبین: احمد کمال حشمی	آیاتِ سخن	۱۹۹۵ء
افضال عاقل		
نور اقبال	میری آواز سنو	۱۹۹۵ء
قیوم بدر	دُخل در معقولات	۱۹۹۷ء
عبدالودود انصاری	سائنس اور ٹکنالوجی میں مسلمانوں کا کردار	۱۹۹۹ء
حشم الرضمان	میری نظمیں میرے گیت	۲۰۰۰ء
زماں قاسمی	ریت اڑتی رہی	۲۰۰۱ء
عبدالودود انصاری	مسلمانوں کی سائنسی پس ماندگی کے اسباب	۲۰۰۱ء
	پرندہ، کوئز، جانور کوئز، سانپ کوئز،	۲۰۰۲ء
عبدالودود انصاری	کیڑا کوئز، مچھلی کوئز، فلک کوئز	
خورشید اقبال	اردو ماہیا	۲۰۰۲ء
عبدالودود انصاری	استاد ایک عظیم شخصیت	۲۰۰۳ء
ایڈیٹر: خورشید اقبال	کائنات: پرنٹ ایڈیشن	۲۰۰۴ء

احمد کمال شمی	سفر مقدر ہے	ء ۲۰۰۵
نور اقبال	ہم آزاد ہیں	ء ۲۰۰۶
عبدالودود انصاری	مسلمانوں کی سائنسی پیمانہ نگاری: منظر پس منظر	ء ۲۰۰۶
حشم الرمضان	قلم بولتا ہے	ء ۲۰۰۷
قیوم بدر	ہم قبرستان سے بول رہے ہیں	ء ۲۰۰۷

کانکی نارہ وجگندل کا ادبی منظر نامہ: آزادی کے بعد

آزادی کے بعد ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس وقت شعر و شاعری کے افق پر انتشار، مایوسی، بے یقینی اور ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ان حالات میں اردو کے شعراء پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ شعراء متاثر تو ہوئے بھی لیکن ناامید نہیں ہوئے۔ انھوں نے حالات سے نبرد آزما ہونے کی، اپنے اندر قوت پیدا کی۔ نئے شعری تجربات کیے اور اردو شاعری کو ایک نئی جہت، ایک نئی سمت سے ہم کنار کیا۔

مغربی بنگال کی راجدھانی کو لکاتا (سابق کلکتہ) میں اس وقت جمیل مظہری، پرویز شادہی، سالک لکھنوی اور ابراہیم ہوش کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا جب کہ کلکتہ کے مضافات میں ناظر الحسنی، ساگر چاندانی، حشم الرمضان، ارمان شام نگری، ابراہیم ناشاد اور واقف رزاقی نے شاعری کا چراغ روشن کر رکھا تھا۔

حشم الرمضان اور ارمان شام نگری یہ دونوں اساتذہ روشنی کے مینار کا کام کر رہے تھے۔ اس مینار کی روشنی قرب و جوار کے علاقوں تک پہنچ رہی تھی جو شعر و شاعری کے دیوانوں کے لیے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا کام کر رہی تھی۔

حضرت حشم الرمضان کا شمار بنگال کے اساتذہ میں کیا جاتا ہے۔ مضافات کلکتہ کے ادبی افق پر ان کی حیثیت آفتاب کی سی ہے جس کی روشنی سے بے شمار ستارے روشن ہیں۔ پروفیسر مشتاق احمد نے بجا طور پر انھیں ضلع چوبیس پرگنہ کے شاعروں کا سالار قرار دیا ہے۔ ان کی دو کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں ”میری نظمیں میرے گیت“ اور ۲۰۰۷ء میں ”قلم بولتا ہے“ (تنقیدی و تحقیقی مضامین)۔ ان کے کلام میں فن کی پختگی، تخیل کی بلندی اور قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔

ہر ایک جسم پہ تھا غزنوی لباس مگر
ہر ایک روح گرفتارِ سومنات لگی
وقت کے خداؤں کی مجرمانہ غفلت پر
بندگی کو لازم ہے معرکہ نیا چھیڑے
مختار ہو تو اس سے تنکا بھی اٹھ نہ پائے
مجبور ہو تو انسان کوہِ گراں اٹھا لے
سر جھکے جب تو روندے گئے پاؤں سے
سر ابھارے نہ تو سرکشی کیا کرے
اب تو پل پل میں چہرے بدلنے لگے
آدمی پر یقین آدمی کیا کرے

حضرت عبدالرزاق شاکی کا شمار کانکی نارہ کے بزرگ شعراء میں کیا جاتا ہے۔ اردو، عربی اور فارسی کی صلاحیت ان کے اندر غضب کی تھی۔ شروع میں شاکی صاحب کجری، قوالی وغیرہ لکھتے تھے۔ غزلوں کی طرف ان کی توجہ بہت بعد میں ہوئی۔

تجھ کو مہروں کے آنچل کے اٹنے کی قسم
پھر اسی طرح سے چل بادِ صبا آخرِ شب
اک عمر کڑی دھوپ میں فرقت کی کٹی ہے
زلفوں کی گھٹا آج ذرا جھوم کے برس
گو طبع رواں میں جولانی باقی نہ رہی شاکی لیکن
جب شعر و سخن کی بات آئی ارمانِ تکلم جاگ پڑا

جکتدل کے شعراء میں سیفی الاعظمیٰ کا ایک خاص مقام تھا۔ ۱۹۵۲ء-۱۹۵۳ء کے قریب بیرہ پاڑہ نامی مقام پر مقیم تھے۔ ان کے ارد گرد شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ تھا جس میں عامل، مظہر، محمور، عازم، کوکب، رہبر وغیرہ مشہور تھے۔ انھوں نے جکتدل سے ایک رسالہ ”ساوات“ کی ادارت بھی کی تھی۔ ان کا ایک شعریں ہے ۔

دو ہاتھ ملے لرزاں لرزاں ، کچھ عہد ہوئے افناں خیزاں
کچھ ٹوٹ پڑے تارے سیفی ، اللہ وہ رخصت کا عالم
ابراہیم ناشاد کا تعلق گزشتہ صدی کی ساٹھویں دہائی سے تھا۔ بعد میں وہ کھانا چلے گئے تھے جو بنگلہ دیش میں واقع ہے۔

نیکوں کے بیچ چن لیتے ہیں بدیوں کے پرند
زندگی کے کھیت پر پہرا لگانا چاہیے
رہبر بلیاوی کا شمار سیفی الاعظمیٰ کے عزیز شاگردوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ان کا اصل نام تفضل حسین تھا۔ سنہ پیدائش ۱۹۳۳ء تھی۔ شاہ توارضلع بلیا کے رہنے والے تھے۔ ملازمت کے سلسلے سے مستقل قیام جکتدل کے بیرہ پاڑہ میں تھا۔ تقریباً ۷۴ سال کی عمر میں ۱۶ نومبر ۲۰۰۷ء کو انتقال ہوا۔ نمونہ کلام ۔

مرے سینے کی دھڑکن اس قدر کیوں تیز کے ساقی
کہ جس سے دل کا پیانہ مرا لبریز ہے ساقی
نہ دل لگتا ہے گلشن میں نہ صحرا میں بہلتا ہے
مری آنکھوں کا دریا اب تلاطم خیز ہے ساقی
واقف رزاقی کا نکی نارہ کی ایک متحرک سماجی، سیاسی اور ادبی شخصیت کا نام ہے۔ درس و تدریس کے پیشے سے منسلک تھے، اب سبک دوش ہو چکے ہیں۔ شروع میں بانیں بازو کے خیالات سے متاثر تھے، اب سوشلزم کا دم بھرتے ہیں۔ ایک زمانے میں سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اب چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن معاملہ کمبل والا ہے۔ ادبی محفلوں کی جان ہیں۔

اہلِ خرد انگشتِ بدنداں ، اہلِ نظر حیراں حیراں
باندھے ہوئے دستارِ فضیلت گھوم رہا ہے جاہلِ دیکھ
میرے حصے کی ساری خوشی چھین لی
زندہ رکھا مگر زندگی چھین لی

قص میں ہے حوا کی بیٹی آدم کے بیٹے ہیں مست
 جھوم رہے ہیں شیشہ و ساغر کیسے کوئی بھاگے گا
 ممکن ہے کہ تم روک لو رفتارِ زمانہ
 واقف کی زباں اور قلم روک سکو گے

پروفیسر مجیب الحق مجیب دارجلنگ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے استاد تھے۔ نہایت باصلاحیت آدمی تھے۔ انگریزی سے عربی سکھانے والی کتاب ”العربیہ“ (۱۹۷۸ء) کے مصنف تھے۔ پروفیسر وحید عرشی ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی ایک آزاد نظم ”تیکا“ کے عنوان سے ”شاعر“ نامی رسالے میں نظروں سے گزری۔

خدا تیکا نہیں ہے
 مگر تیکے سے بھی کمزور ہے وہ
 جی تو ڈوبنے لگتے ہیں جس دم
 تو تیکے کا سہارا ڈھونڈتے ہیں
 جو تیکے کا سہارا بھی نہ پائیں
 خدا کا تب سہارا ڈھونڈتے ہیں

خدا تیکا نہیں ہے
 مگر تیکے سے بھی کمزور ہے وہ

صابر گیاوی کا اصل نام محمد یوسف تھا۔ ۱۹۶۴ء کے فساد کے بعد کلکتہ کو خیر باد کہہ کر کائناتی نارہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ سوز سکندر پوری سے نسبت تھی۔ کبھی کبھی اپنے کو صابر وارثی بھی لکھتے تھے۔ صابر صاحب کیف و مستی کے شاعر تھے۔ حسن و عشق ان کی شاعری میں رچ بس گیا تھا۔

ابھرا ہے نہ ابھرے گا کبھی ڈوبنے والا
 ہم معجزہ چاہ ذقن دیکھ رہے ہیں
 ابرو پہ بل ہے کس کی قضا آگئی حضور
 شمشیر آبدار برہنہ ابھی سے ہے
 ہوش اب تک نہیں اک جام پیا تھا میں نے
 پینے والے تو شب و روز پیا کرتے ہیں

حشمت الرمضان کے شاگردوں میں وفا سکندر پوری کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ادبی افتخ پر نمودار ہوئے۔ ابتداء میں عبدالمنان صبر سے مشورہ سخن کیا۔ نظمیں اور غزلیں دونوں لکھتے ہیں۔ غزلوں میں ان کا انفرادی رنگ زیادہ ابھرتا ہے۔ کم لکھتے ہیں مگر خوب لکھتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ابھی تو جینے والوں کی ادائیں نامکمل ہیں
 ابھی تو زندگی کے سر کئی الزام آئیں گے
 اچھا ہوا جنوں کی پناہوں میں آگیا
 فرزنگی میں رشتہ جاں اک سوال تھا
 کتنا محتاط ہے وہ رسم شناسائی سے
 اپنی پہچان کے ماتھے پہ شکن رکھتا ہے
 جس طرف جاؤ ، جسے دیکھو ، جہاں ٹھہرو وفا
 آسمان دشمن ، مخالف لوگ ، زہریلی زمیں

ڈاکٹر سراج عرشی کی شاعری کا تعلق بھی چھٹی دہائی سے تھا۔ مضافات کے مشاعروں میں ان کی شخصیت بہت مقبول تھی۔ ان کے غزل پڑھنے کا ایک منفرد انداز تھا۔ تحت میں پڑھتے تھے۔ الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حرکات و سکنات بھی اس طرح کرتے تھے کہ لوگوں کی توجہ کامرکز بن جاتے تھے۔

کس بھیڑ میں کھڑے ہو کہ تنہائی بڑھ گئی
 یا سوچتا نہیں ہے یا مینائی بڑھ گئی
 مت کھیلے یہ کھیل محبت کی راہ میں
 ہو آبرو کسی کی مگر آبرو تو ہے
 سچ بات تو کہے گا تو عرشی یہ سوچ لے
 لے دے کے تیرے حصے میں تنہائی آئے گی

دل عرفانی شعر و شاعری کے میدان میں ۱۹۶۰ء میں وارد ہوئے۔ اول ارمان شام نگری کی شاگردی اختیار کی، بعد میں حشم الرمضان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ ان کا مشاہدہ کافی تیز ہے۔ فن شاعری پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں اک ایسی غزل کہی جائے
 خموشیوں کے حوالے سے جو سنی جائے
 تصورات کی آنکھوں میں جب نفی دیکھی
 مرے خیال نے گھبرا کے خودکشی کر لی

حرفِ معتبر ، نامعتبر کیا
 بدل جاتے ہیں اندازِ نظر کیا
 لکیروں پر لکیریں پڑ رہی ہیں
 کہیں درپیش ہے کوئی سفر کیا

عارف گورکھپوری اردو شاعری کے افق پر ۱۹۶۲ء میں نمودار ہوئے۔ ارمان شام نگری اور زار غازی پوری سے مشورہ سخن کیا۔ ان کی شاعری کلاسیکی اور ترقی پسند رنگ و آہنگ سے عبارت تھی۔

حسرت تھی ، اضطراب تھا ، دہشت تھی ، جبر تھا
اس کے علاوہ شہر ستنگر میں کچھ نہ تھا
ابھی بھی شک ہے تجھے میری پاس داری پر
سکوں گنوا یا ہے میں نے تری خوشی کے لیے
پتھروں کے شہر میں عارف تو پتھر بن گیا
موم بن کے اب کوئی شام و سحر پگھلا کرے

ڈاکٹر معصوم شرقی کی شاعری کی ابتداء ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ معصوم شرقی ان معنوں میں خوش نصیب شاعر ہیں کہ انھیں
کئی اساتذہ فن سے اکتسابِ علم کا موقع ملا۔ ارمان شام نگری، جرم محمد آبادی، حشمت الرمضان، ناظم سلطان پوری اور اعزاز
افضل۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اشک امرتسری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر اردو ادب میں نظیر ثانی کی بازیافت کی۔ غزل
کے علاوہ ان کے ادبی مضامین بھی اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

تری زمین پہ مالک ہزار فتنے ہیں
کسی بھی پل نہیں رہتا ہے اب قرار مجھے
کارگاہِ دہر میں رہے سدا گرم سفر
بے حسی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
گفتگو میں چاہیے آدابِ محفل کا خیال
اختلاف اپنی جگہ ، شائستگی باقی رہے
دشمن کے طنز کو بھی سلیقے سے ٹال دے
اپنے مذاقِ طبع کی ایسی مثال دے

شاعر اپنے وقت کا پیامبر ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے قمر بیامی اپنے کو بیامی لکھتے ہیں۔ ادبی افق پر ۱۹۷۲ء میں ظاہر
ہوئے۔ ارمان شام نگری کے شاگردوں میں ہیں۔ افسانے، مضامین اور کہانیاں لکھتے ہیں۔ شاعری میں ادب برائے زندگی
کے قائل ہیں۔

لائی تو کس مقام پہ اے زندگی مجھے
جو ناگ بن کے ڈسنے لگی ہر خوشی مجھے
کون کہتا ہے کہ اک پل میں مٹا دیتی ہے موت
جب بھی الٹو گے ورق ، پاؤ گے زندہ مجھ کو
دیوارِ شوق اجنٹا کا خواب لگتا ہے
ہر ایک چہرہ مقدس کتاب لگتا ہے

نور اقبال صحیح معنوں میں ایک نظم گو شاعر ہیں۔ ارمان شام نگری، حشمت الرمضان اور قیصر شمیم سے شرفِ
تلمذ حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں حالات و ماحول کی عکاسی طنزیہ پیرائے میں ملتی ہے۔ میری آواز سنو

(۱۹۹۵ء)، ہم آزاد ہیں (۲۰۰۶ء) اور بچوں کی نظمیں ”جھرنا“ شائع ہو چکی ہیں۔ نظموں میں روزمرہ، میری آواز سنو، ووٹروں کے نام، میرا قلم متاثر کن ہیں۔

چراغ لے کے سر راہ پھر رہے ہیں ہم
ہمارے شہر کی اے آندھیو کہاں ہو تم
میرے سارے ہم نوا منزل کو اپنی جا لیے
میں فقط ہر ذات پر تنقید کرتا رہ گیا
بناتا بھیس تو میں بھی فقیر ہو جاتا
کسی مزار پہ رہتا تو پیر ہو جاتا

خلش امتیازی کو شاعری ورثہ میں ملی۔ اپنے والد امتیاز حسین چنیل اور ارمان شام نگری سے کسب فیض کیا۔ باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۷۲ء سے ہوا۔ مطالعہ وسیع ہونے کے سبب خلش کی غزلوں میں ندرت اور وسعت پیدا ہوئی۔ ساعتوں کی طرح مسکرانے والے اس شاعر پر حادثات کا سورج کیا گرا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ہم تو جنوں کی ایک مقدس کتاب ہیں
شہر ہوس میں آج کا اخبار بن گئے
دل کا احوال سنے ، نالہ دیوانہ سنے
کس کو فرصت ہے کہ اس دور میں افسانہ سنے
یہ دور معرکہ ہے ، ہجرتوں کی مت سوچو
یہ طرز فکر تمہیں روسیہ کر دے گا
تیری آنکھیں تو ہیں کشمیر کی جھیلوں کی طرح
تیری آنکھوں سے کہاں دل کا شکارا جائے

یونس اشرف ۱۹۷۴ء میں زلفِ غزل کے اسیر ہوئے۔ ابتدا میں حضرت حشمت الرضوان سے اصلاح لی۔ فی الحال اپنی طبیعت پر بھروسہ کرتے ہیں۔

حق بولنا بھی جرم ہے یہ جانتے ہوئے
حق بولتا ہے شخص جو جانباز مرد ہے
پرکھ کے دیکھوں گا ، شہرت کا میں نہیں قائل
وہ شخص فکر و نظر کا امین ہے کہ نہیں
سمندر راہ بدلیں گے ، نئی آبادیاں ہوں گی
ابھی دنیا کے نقشے میں بڑی تبدیلیاں ہوں گی

صابر اقبال کا شمار ارمان شام نگری کے ذہین شاگردوں میں کیا جاتا ہے۔ شاعروں کی بھیڑ میں ان کی الگ پہچان ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں محکمہ بجلی کے دفتر سے جڑے ہیں لہذا دماغ بھی بجلی کی سرعت سے کام کرتا ہے۔ فن کے رموز و

نکات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ مطالعہ و مشاہدہ عمیق ہے۔ ماضی میں کئی ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے۔ فی الحال قرطاس و قلم کے صدر ہیں اور نوجوان ذہنوں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ افسانے، مضامین اور تبصرے بھی لکھ چکے ہیں جو انشاء کلکتہ، اثبات و فی کلکتہ، دستک ہوڑہ، رنگ دھندلا اور کائنات جگندل کی زینت بن چکے ہیں۔

جذبوں کو لفظوں کا پیرا ہن دینا، ان میں وہ تاثیر پیدا کرنا کہ سیدھے قلب میں اتر جائیں، یہ فن صابر اقبال کو خوب آتا ہے۔

پورس کے خوددار لبوں سے ایسا جملہ ٹوٹ گیا
فاتحِ اعظم ہار گیا اور جیت کا نشہ ٹوٹ گیا
ادب سے بات کرنی ہو تو آسانی نہیں ہوتی
غزل اتنی مہذب ہے کہ من مانی نہیں ہوتی
کسی بھی حال میں بیچا نہیں بڑی بی نے
نہ جانے کون سی دولت تھی پاندان میں گم
نوکِ خنجر پہ جو منوایا تو کیا بات ہوئی
بات تو جب ہے کہ تو بات سے قائل کردے
کوئی زمین پہ اترے تو کوئی بات بنے
ہر ایک شخص ہے اپنے ہی آسمان میں قید

۱۹۷۰ء کے بعد کے شعراء کی جو نسل سامنے آئی اس کے اندر خود اعتمادی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے احساسِ کمتری کے لبادے کو اتار پھینکا۔ ماقبل کے شعراء اشاعت کے معاملے میں گھبراہٹ کے شکار تھے لیکن نئی نسل جو کچھ محسوس کر رہی تھی، اسے فوراً منظرِ عام پر لانا چاہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تخلیقات، اخبارات و رسائل کی زینت بننے لگیں، بعد میں دیکھا یہ گیا کہ کچھ لوگوں کی خود اعتمادی بجائے اور کچھ لوگ خوش فہمی کے شکار تھے۔

۱۹۸۰ء تک ادبی فضا بڑی حد تک سازگار بن چکی تھی۔ اس فضا میں جو شعراء ادبی اسٹیج پر نمودار ہوئے ان میں یہ خاکسار زماں قاسمی، خورشید اقبال، احمد کمال شمی، ارشد جمال شمی، خواجہ جاوید اختر، عظیم انصاری، بلند اقبال اور وکیل علی کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔ یہ شعراء ماقبل کے شعراء سے ایک قدم اور آگے نکلے۔ انٹرنیٹ کی سطح پر شعروادب کا چرچا ہونے لگا۔ کلکتہ کی ادبی فضا میں مضافات کا نام گونجنے لگا۔ آواز کا جادو لوگوں کے دلوں کو اسیر کرنے لگا۔ شعر و سخن کی یہ آواز اتنی توانا تھی کہ اس کی دھمک ہندوستان گیر بیٹانے پر سنی جانے لگی۔

یہ خاکسار اپنے بارے میں کچھ لکھنے سے زیادہ بہتر سمجھتا ہے کہ پروفیسر اعجاز افضل کی رائے جو انھوں نے ”ریت اڑتی رہی“ (غزلوں کا مجموعہ ۲۰۰۱ء) پر دی تھی، پیش کر دی جائے۔

”زماں قاسمی کا سیاسی شعور بیدار اور سماجی حس تیز ہے۔ مزدور علاقے میں پلے بڑھے ہیں، محنت کشوں کے دکھ درد سے واقف ہیں۔ ان کی شاعری کسی بے فکرے نوجوان کی داستانِ معاشقہ نہیں بلکہ ایک ذمہ دار، جفاکش انسان کے تجربوں اور مشاہدوں کا نچوڑ ہے۔ وہ اپنی بات سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنا جانتے

ہیں۔ صنعتوں کا کرتب نہیں دکھاتے۔“

ڈاکٹر شاہد اختر کی رائے کچھ اس طرح تھی۔

”زماں قاسمی زندگی کے اثبات کا شاعر ہے۔ وہ ہار نہیں مانتا۔ کوئی واقعہ، کوئی حادثہ اسے کبیدہ خاطر تو کر سکتا ہے مگر مایوس نہیں..... وہ غالب کی طرح ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہتا ہے اور یہی چیز اس کی شاعری کو درجہ اعتبار عطا کرتی ہے۔“

خاکسار نے غزلوں کے علاوہ نظمیں اور ادبی مضامین بھی لکھے ہیں جو مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔

جہاں میں کوئی اچانک بڑا نہیں ہوتا
جلے ہیں دھوپ میں تب سائبان والے ہیں
اب آسمان سے کوئی مدد نہ آئے گی
ہمیں کو کرنا ہے سر آج مرحلے بھی نئے
حوصلہ ہارنا ہم نے سیکھا نہیں
لاکھ کشتی رہے اپنی منجھار میں
انساں کی پرستش ہم اے دوست نہیں کرتے
دستور نہیں اپنا بندوں کو خدا کہنا

خورشید اقبال کی شاعری ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آئی۔ شروع میں درسی کتابیں اور سائنسی مضامین لکھے، نظمیں لکھیں، اب دھیان غزلوں پر ہے۔ نظموں میں زندگی، اک نیا تاج محل، مثلث، تم بن، مایوس لحات کا مشورہ متاثر کن ہیں۔ انجمن ہائی اسکول بارک پور میں ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ادارہ قرطاس و قلم کے سکریٹری ہیں۔ ساتھ ہی آن لائن میگزین ”کائنات“ (جس کے ایڈیٹر وہ خود ہیں) کے ذریعہ عالمی سطح پر جکتدل کی پہچان دنیا بھر میں بنائے ہوئے ہیں۔ نہایت فعال شخص ہیں۔

سر اپنے اعتبار کا خم کر کے رکھ دیا
جھوٹے قلم نے سچ کو قلم کر کے رکھ دیا
پلکوں پہ احتیاط کا پردا نہیں رہا
اس دل پہ اب دماغ کا پہرا نہیں رہا
بھرتی خواہشیں دل میں سنبھال کر رکھنا
بڑا کٹھن ہے درندوں کو پال کر رکھنا
ہر ایک رات دبے پاؤں وہ اترتا ہے
مرے خیال کے آنگن میں چاندنی بن کر

عظیم انصاری ۱۹۸۱ء میں افق شاعری پر نمودار ہوئے۔ شرف تلمذ صابراقبال سے ہے۔ بنگلہ افسانوں/کہانیوں کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا۔ ادبی کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ قرطاس و قلم کی ماہانہ ادبی نشستیں انھیں کے دولت کدے

(رحمت منزل) پر منعقد ہوتی ہیں لہذا وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔

سب سخن در یہیں پہ آتے ہیں
میرے گھر کو ادب کا گھر کہنا
کعبہ دل کو بھی مسمار کیا کرتے ہیں
کتنے بے درد ہیں اے دوست زمانے والے
سب کی آنکھوں میں بدگمانی ہے
یہ جوانی بھی کیا جوانی ہے
ملیے سب سے سنبھل سنبھل کے عظیم
مطلبی آج کا زمانہ ہے

خلش امتیازی کے شاگردوں میں بلند اقبال کا نام سر بلند رہا۔ ۱۹۸۳ء میں ادبی منظر عام پر آئے اور سب سے الگ ردیف میں غزل لکھنے کا امتیاز حاصل کیا۔

تصویر شاہ کار وہ لاکھوں میں بک گئی
جس میں بغیر روٹی کے بچہ اداس ہے
غم کا سورج بھی سرد ہو جائے
سر پہ آنچل جو میری ماں رکھ دے
پھر سے ہوا ملی ہے تعصب کی آگ کو
پھیلے گا بستیوں میں دھواں دور دور تک

احمد وکیل علی ۱۹۸۵ء میں ادبی افق پر نمودار ہوئے۔ خلش امتیازی سے نسبت رہی۔ غزلوں کے علاوہ افسانے اور ادبی مضامین بھی لکھ کر ادب میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں (جن میں ٹیچر، لیڈر شامل ہیں) کو بھی سدھارنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ سہل ممتنع میں غزل کہنے کا شوق ہے۔

منزل مل ہی جائے گی
کوشش اپنی جاری رکھ
دور تک سلسلہ ہے پیڑوں کا
پھر بھی سایہ نظر نہیں آتا
کوئی امید رکھ نہ بیٹوں سے
بوجھ اپنا تو خود اٹھا بابا

بیسویں صدی کی نوئیں دہائی میں حشمی برداران کی جوڑی منظر عام پر آئی جسے اپنی ذہانت اور صلاحیت پر پورا بھروسہ تھا۔ حشمی برداران میں احمد کمال حشمی کو زیادہ شہرت ملی۔ WBCS کے امتحان میں سرخرو ہو کر ریونیو آفیسر (شعبہ ارضیات حکومت مغربی بنگال) کے عہدے تک پہنچے۔ آیات سخن (۱۹۹۵ء) اور سفر مقدر ہے

(۲۰۰۶ء) کے ذریعہ ادبی دنیا میں اپنی شناخت مستحکم کی۔ اثبات و نفی ایوارڈ سے نوازے گئے۔ مستقبل میں احمد کمال شمش سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔

کسی بھی چھت کو بلندی کبھی نہیں ملتی
انہیں بٹھاتے نہ سر پر اگر در و دیوار
تکتا رہا میں پیاس کی شدت لیے ہوئے
اور لے گیا وہ سارا سمندر خرید کر
ابتدا بھی انتہا بھی خاک ہے
زیست کیا ہے اک سفر مٹی کا ہے
ہر دور میں حسین بہتر رہے فقط
ہر دور میں یزید کو لشکر دیا گیا
شیشے بھی تیار کھڑے ہیں
سوچ سمجھ کر آئے پتھر

ارشاد جمال شمش، احمد کمال شمش کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بڑے بھائی کے نقش قدم پر چل کر WBCS کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ B.D.O. کے ساتھ ساتھ ڈپٹی مجسٹریٹ کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہیں۔ غزلوں کے ساتھ نظموں پر بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ میں ترارا جکمار نہیں، انتباہ ہم مرے پاس آؤ متاثر کرنے والی نظمیں ہیں۔

قصے چلے وفا کے تو چلتے چلے گئے
ٹانکے کھلے تو زخم نکلتے چلے گئے
صرف اس لیے کہ میں نے بھی مانگی تھی تھوڑی دھوپ
سورج کی سلطنت سے ٹکنا پڑا مجھے
اپنا ضمیر بیچ کے سوتا ہے چین سے
سب سے بڑا تھا اس کا جو دشمن نہیں رہا

خواجہ جاوید اختر شعری افق پر ۱۹۸۵ء میں نمودار ہوئے۔ تعلق کا کئی نارہ سے ضرور ہے لیکن بغرض معاش وہ الہ آباد منتقل ہو چکے ہیں اور ان کی شاعری وہیں شہرت کے منازل طے کر رہی ہے۔ ترنم سے غزل پڑھتے ہیں اور بقول شخصے مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔

خبر کیا تھی فضیحت میں وہ میری جان کر دیں گے
مجھے بھی ایک دن کے واسطے سلطان کر دیں گے
آندھی تمام پیڑ گرا کر چلی گئی
بد قسمتی کہ اس کو مرا گھر نہیں ملا
کا کئی نارہ کے رہنے والے ہیں جاوید ہم

ہے ہمارا بھی تعلق مغربی بنگال سے
خورشید بھارتی ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آئے۔ اپنے ذوقِ سلیم اور شاعر دوستوں کے نیک مشوروں کو مشعلِ راہ سمجھتے
ہیں۔ ملازمت کے سلسلے سے مرزا پور میں قیام ہے۔

میں روشنی کی بلندی کو چھونے نکلا ہوں
دیا سنبھالے مرا انتظار مت کرنا
میں راستے میں تھا تو بڑی تیز دھوپ تھی
پایا گھنا درخت تو بادل بھی چھا گیا
سمیع الفت کا نام قرطاس و قلم کی ماہانی نشستوں میں ابھر کر سامنے آیا۔ صابر اقبال کے شاگردوں میں نہایت ہی
سعادت مند شاگرد ہیں۔ کائنات مئی ۲۰۰۴ء کے شمارے میں ایک غزل نظروں سے گزری۔
موٹی کا کیا قصور جو چکرا کے گر پڑے
وہ جلوہ کوہِ طور پہ ایسا ہی تھا کہ بس
چراغِ عزم بنا ہوں دعاء کے صدقے میں
مجال کیا کسی طوفان کی جو بجھا دے مجھے

شعراء کے قافلے سے الگ نثر نگاروں کا بھی ایک کارواں چلتا رہا۔ اپنی ادبی شناخت کی خاطر وہ منزل پہ منزل مارتا
ہوا آگے کی طرف بڑھتا رہا۔ ڈاکٹر محمد منصور عالم، بشیر الدین ظامی، قیوم بدر، جاوید نہال ششمی، عبدالودود انصاری، محمد علی صدیقی،
عظیم اللہ ہاشمی، مختار الحق، محمد کلیم الزماں انصاری اور ایوب رضا کے نام یہاں گنائے جاسکتے ہیں۔ جو اس کارواں میں شامل
ہیں۔ منصور عالم کی حیثیت اس کارواں میں ہر اول دستہ کی ہے۔ ڈاکٹر منصور عالم (جونی الحال پبلک سروس کمیشن کے باوقار
عہدے پر فائز ہیں) نے جگتدل کی آب و ہوا میں پرورش پائی۔ کئی درسی کتابوں کے مصنف بنے۔ ارشد جمال کے نام سے
اشعار بھی لکھے۔ بعد میں نثر کی جانب متوجہ ہوئے۔ فارسی ادبیات پر ان کی کئی کتابیں مشہور ہوئیں۔ ”پروفیسر عباس علی خاں
بیخود فن اور شخصت“ کے مرتب بھی ہیں۔ ان کے تحقیقی اور علمی مضامین گاہے گاہے منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔

بشیر الدین ظامی نے ۱۹۷۵ء میں ”بھنور“ نامی ناول اور ۱۹۷۸ء میں نئی زندگی (ناول) تصنیف کر کے اپنی ادبی
شناخت قائم کی۔ نثر نگاروں کے کارواں کا انھیں دوسرا سالہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

قیوم بدر نے طنز و مزاح کا میدان چنا۔ ۱۹۹۷ء میں ”دخل در معقولات“ اور ۲۰۰۷ء میں ”ہم قبرستان سے
بول رہے ہیں“ تصنیف کر کے ادب میں اپنی پوزیشن مستحکم کی۔ اپنی تحریری صلاحیت کا لوہا منوایا۔
قیوم بدر کی تحریر میں سادگی کے ساتھ شوخی بھی پائی جاتی ہے۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے وہ اپنے موضوعات کا
انتخاب کرتے ہیں اور اسی میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں۔ کالونی کا بکرا، چوں چوں کا مربہ، گول گھر، مکھن کے
فائدے، تبادلہ خیال ان کے مشہور مضامین ہیں۔

عبدالودود انصاری اپنے سائنسی مضامین کے ذریعہ بچوں کے ادب میں برابر اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کے سائنسی
مضامین مختلف رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ درجنوں درسی (سائنس سے متعلق) کتابوں کے مصنف رہ چکے ہیں۔

مسلمانوں کی سائنسی پس ماندگی کے اسباب (۱۹۹۹ء) جانور کوئز (۲۰۰۳ء)، مسلمانوں کی سائنسی پس ماندگی منظر پس منظر (۲۰۰۶ء) جیسی معلوماتی کتابیں منصہ شہود پر آ کر مقبول بھی ہو چکی ہیں۔ مختلف اسکولوں میں حکومت کی نمائندگی کرنے کا فخر بھی انھیں حاصل ہے۔ ٹیچرس ٹریننگ کالج، نالی کل ضلع ہوگلی میں پرنسپل کی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں، فی الحال مغربی بنگال میں سائنسی ادب ۲۰۰۸ء کے مقالہ پر کام کر رہے ہیں۔ جاوید نہال شمش ۱۹۸۲ء سے افسانے اور کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے پیام تعلیم، بانو، بتول، پاسبان، نئی دنیا اور انشاء کلکتہ کی زینت بن چکے ہیں۔ نمائندہ افسانوں میں دیوار، نئی صبح، طمانچہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے دو تین ڈرامے بھی اسٹیج کی زینت بن چکے ہیں بلکہ ”رجنی“ نامی ڈرامہ ۲۰۰۳ء کے انٹر اسکول مقابلے میں پہلے انعام کا حقدار بھی بن چکا ہے۔

محمد علی صدیقی کا تعلق مانک پیر (کانکی نارہ) سے ہے۔ چشمہ رحمت ہائر سکندری اسکول میں کامرس کے ٹیچر ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھ چکے ہیں۔ جلتے ہوئے مسائل جیسے بش کی عالمی غندہ گردی، دھنجنے کی پھانسی، لڑکیوں کی تعلیم ضروری کیوں، بنیادی تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت پر مضامین اخبارات میں آچکے ہیں۔ مختصر یہ کہ کشت ادب کی زمین کو نم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

عظیم اللہ ہاشمی نے اپنا مقالہ ”اردو افسانے کا موضوعاتی مطالعہ“ ڈاکٹر عبدالمنان کی نگرانی میں مکمل کیا۔ حالاتِ حاضرہ کے پس منظر میں وہ اپنا افسانہ تخلیق کرتے ہیں اور اپنے کو عصری ادب کا ترجمان بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے کئی افسانے اخبارات و رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ کنواری ماں، وصیت، صدائے سرحد، اعتماد کا زخم، سو بار جنم لیں گے ان کے مشہور افسانے ہیں۔

مختار الحق کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نویسی سے ہوا۔ انھوں نے صحافت میں ڈپلومہ کیا ہے۔ پہلے ”اخبار مشرق“ سے وابستہ تھے، اب ”راشٹریہ سہارا“ میں سب ایڈیٹر ہیں اور صحافتی ذمہ داریاں بحسن و خوبی نبھا رہے ہیں۔ برسوں پہلے تہذیب الاخلاق میں ان کا ایک مضمون نظروں سے گزرا تھا۔ آزاد نظموں کے ساتھ ساتھ ادبی مضامین لکھنا، کتابوں پر تبصرے کرنا، شوق میں شامل ہے۔

کلیم الزماں انصاری ۱۹۷۹ء سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ کہانیوں میں دو بھائی، تین دوست، لٹیر اکون، شناختی کارڈ اخبار مشرق کی زینت بن چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مٹی کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ محنت اور قسمت، دو بیوقوف ٹھگ کا فی مقبول ہو چکی ہیں۔ گاہے گاہے فلمی مضامین بھی اخبارات و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔

ایوب رضا کی صلاحیتوں کا اظہار نثر کے میدان میں ہوا ہے۔ ان کے مضامین ”سرسید: شخصیت و فن“، ”خلش امتیازی: وہ ایک شمع جو بجھ گئی“ اور ”وحید عرشی: غم حیات کا شاعر“ کو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ ان کا آخری مضمون الف انصاری نے اپنی تحقیقی کتاب ”شعرائے بنگالہ- حصہ اول“ میں شامل کیا ہے۔ افسانوں میں تذبذب، حاجی شکور، مالک بھانو پر تاپ سنگھ قابل ذکر ہیں۔ ایوب رضا کے اندر نثر نگاری کی اچھی صلاحیت موجود ہے لیکن اس کا ابھی تک بھرپور اظہار نہیں ہو سکا ہے۔

۲۰۰۰ء کے بعد شاعروں اور ادیبوں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی ہے جس نے اپنی غزلوں، نظموں، افسانوں اور مضامین کے ذریعہ ادبی میدان میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ عبدالوہاب انصاری، اصغر احسن، خواجہ احمد حسین، رضا

علوی، علی حسین شائق، عین میم تابش، روشن ضمیر، احمد منیر، نسیم اشک، معید رشیدی، سوز اختر، فیروز کوثر اور فیروز سکندر شاہی اسی کھیپ کی پیداوار ہیں۔ ناموں کی اس بھیڑ میں کسی کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اعتبار کے درجے تک پہنچنے کے لیے محنت اور ریاضت کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ کون ناکام ہوگا اور کون شاد کام اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔ تاہم ایک بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ معید رشیدی کا جنون کامرانی سے ہمکنار ہوگا۔ گزشتہ دو برسوں میں اس نے جیسی ادبی جست لگائی ہے اس کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ شعراء وادباء کا ادبی سفر ابھی بھی جاری ہے۔

منظر حنفی: ”یا خنی“ کے آئینے میں

شطرنج کا کھیل مجھے بچہ پسند ہے۔ اس کھیل کے تعلق سے کھلاڑی بھی اچھے لگتے ہیں۔ ایک دن ”یا خنی“ کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک شعر پر نظر پڑی تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

کٹ جائیں یہ پیدل تو نکل آئیں گی راہیں
فرزین کے لیے ورنہ کوئی گھر نہیں کھلتا

منظر حنفی صاحب کھیل کی باریکیوں سے واقف ہوں یا نہ ہوں، ان کے نوکِ قلم سے شطرنج کا یہ بنیادی نکتہ ضرور سامنے آیا ہے اور اس سے ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس شعر کو پڑھنے کے بعد منظر صاحب کی غزلوں سے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ ”یا خنی“ کا مطالعہ شروع ہوا۔ شطرنج سے متعلق دیگر اشعار تو نہیں ملے لیکن شمشیر آبدار، تیغ و سناں کی دھار رکھنے والے درجنوں اشعار، تلوار بن کر نگاہوں کے سامنے آ گئے۔

زندگی دیکھ ترے ناز اٹھانے والے
سر پہ آجائے تو تلوار اٹھا لیتے ہیں
قلم کو تیز مظفر ، غزل کو تیز کرو
نہ باز آئے گی دنیا تمہیں ستانے سے
آپ نیزے بلند فرما لیں
سر مظفر کو خم نہیں رکھنا
شعروں کے یہ تیر مظفر ، چڑھی کمانیں غزلوں کی
تم جس لہجے میں کہتے ہو ، شمشیر و سناں کیا ہے
لوح و قرطاس اک طرف ہیں ، تخت و تختہ اک طرف
اور میرے ہاتھ میں بھی تیغ ہے ، خامہ نہیں
ہم سجدے میں جھک جاتے ہیں چاہے گردن پر خنجر ہو
اپنا سر اونچا رکھنے کو خود ہی نیزہ بن جاتے ہیں
کیا دیر ہے مجھ کو بھی اجازت ہو رجز کی
حرف آنے لگا نام و نسب تک مرے مولا

زندگی کے ناز اٹھانا، ضرورت پڑنے پر ہاتھوں میں تلوار اٹھالینا، نیزے کے سامنے سر کو خم نہ کرنا، غزلوں کی کمان چڑھا کر شعروں کے تیر چلانا، شمشیر و سناں کی بات کرنا، نام و نسب پر حرف آنے پر رجز کی اجازت طلب کرنا، سر کو اونچا

رکھنے کی خاطر خود نیزہ بن جانا، ہاتھوں میں قلم کی جگہ تیغ سنبھال لینا وغیرہ۔ ایسے مضامین کو ایک طرزِ نو کے ساتھ بندشِ شعر میں لاکر مظفر صاحب فکر کے نئے دروازے کھول دیتے ہیں۔

مظفر حنفی کی غزل میں سوچ کے کئی دھارے چلتے ہیں۔ ان کی قوتِ فکر کسی ایک مرکز پر قیام نہیں کرتی بلکہ گھومتی رہتی ہے اور نت نئے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ سیاسی اٹھل پٹھل، جبر و تشدد یا معاشی استحصال کی بات ہو، ان کے اشعار میں ایک خاص تیور کا آہنگ ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مظفر حنفی کے طنزیہ اسلوب پر ان کے استاد محترم شاد عارفی کا رنگ چوکھا اترتا ہے۔ مظفر حنفی کے نزدیک شاد عارفی کی حیثیت ایک مینارِ نور کی سی ہے جس کی روشنی میں وہ اپنا تخلیقی سفر طے کرتے ہیں۔ وہی تیکھا انداز، وہی تیور جو شاد عارفی کا حصہ تھا، دور سے ان کی غزلوں کی پہچان کرا دیتا ہے۔ طنزیہ پیرائے میں اپنے خیال کو ظاہر کرنا ایک مشکل فن ہے لیکن زبان و بیان پر عبور، فن عروض اور اس کے رموز و نکات کی گہری آگہی، غزل کی روایات کا سچا شعور، مظفر حنفی کی تحریروں کو قابلِ رشک بنا دیتا ہے۔

بلا سے بچھے یا بڑھے تشنگی
سمندر کو آداب کرتے رہو

ہوا ہوا ہے ، توازن بگاڑ سکتی ہے
اگرچہ ناؤ میں تم ہو بھنور میں ہم لیکن
طوفان سے کیا باتیں کی ہیں پیارے مانجھی بتلانا
دریا کو گروی رکھا ہے یا ساحل کو بیچ دیا ہے
سچ بولنے لگے ہیں کئی لوگ شہر میں
دیواریں اٹھ رہی ہیں نئی قید خانے میں
ذرا سی روشنی مانگی تھی رات کاٹنے کو
چراغ اتنے جلے گھر ہی پھونک ڈالا مرا

”یا انی“ ڈاکٹر مظفر حنفی کا دسواں مجموعہ ہے جس کا پیش لفظ آل احمد سرور نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”مظفر حنفی کے شعر پڑھیے تو شاد عارفی کا خیال ضرور آتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ شاد کے یہاں طنز کی کاٹ زیادہ تھی۔“
اس سے قبل ان کی درج ذیل کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں۔

پانی کی زبان	۱۹۶۷ء
تیکھی غزلیں	۱۹۶۸ء
عکس ریز	۱۹۶۹ء
صریر نامہ	۱۹۷۳ء
دپک راگ	۱۹۷۴ء
یم بہ یم	۱۹۷۹ء
طلسمِ حرف	۱۹۸۰ء

کھل جاسم سم ۱۹۸۱

پردہ سخن کا ۱۹۸۶ء

گویا ہر دو برس کے بعد ایک کتاب منصہ شہود پر آئی ہے۔ یہ کم بڑی بات نہیں ہے۔ یا انہی کی غزلوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مظفر حنفی کے اشعار میں توانائی کے ساتھ ساتھ کاٹ دار لہجے کی گونج ہے۔ یہی گونج انھیں دوسرے شعراء سے ممتاز بھی کرتی ہے اور انھیں منفرد بھی بناتی ہے۔ مظفر صاحب شعر نہیں کہتے ہیں، پردہ سخن میں تیر اندازی اور تیغ زنی کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب اتنا واضح اور ادق بیانی سے دور ہوتا ہے کہ قاری کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خاص بات یہ ہے کہ صاف اور واضح اشعار میں بھی معنی کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ جیسے جیسے پرتیں کھلتی ہیں، نئے نئے معانی اچھل کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ ادب کا مجھ جیسا ادنی قاری بھی ان کی غزلوں کو پڑھ کر ایک عجیب سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

فریب کیجیے لیکن ذرا قرینے سے
حضور سوئی سے نیزے نہیں بدل جاتے
خون کے داغ آستنیوں پر
اور تمنے انھیں کے سینوں پر
ہونے لگا ہے ماں کی دعا میں غلط اثر
بیٹی تو گھر میں بیٹھی ہے، بیٹا نکل گیا
ساری بستی پہ نہ لے آئے وہ آفت کوئی
کون ہے، کوہ ندا روز بلاتا ہے جسے
کہاں ہے تیرا قبیلہ کہ راہ پانی دے
عصا نہیں ہے تو جادوگروں سے جنگ نہ کر
میرے مذہب نے سکھایا ہے مظفر مجھ کو
جنگ کی مجھ سے شروعات نہیں ہونے کی

مظفر حنفی جدید اردو غزل کا ایک معتبر نام ہے۔ شاد عارفی کی شخصیت اور فن پر کتاب لکھ کر جہاں انھوں نے شاگردی کا حق ادا کیا ہے، وہیں اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت بھی دیا ہے۔ شاعر کی ایک تیسری آنکھ بھی ہوتی ہے جو مخصوص بصارت رکھتی ہے۔ دنیا میں ہونے والے واقعات و حادثات کو عوامی سطح سے ہٹ کر دیکھتی ہے، سچ بولنے پر زنداں کی دیواروں کا اٹھنا، ذرا سی روشنی مانگنے پر مکانوں کا جل جانا، ہوا کا توازن بگاڑ دینا، سمندر کو آداب کرتے رہنا وغیرہ جیسے خیالات مظفر حنفی کے زور قلم کا خاصہ ہیں۔ قدرت فنکار کو کچھ عطیہ و دیعت کرتی ہے۔ شاعر کا موزوں طبع ہونا عطیہ خداوندی کے زمرے میں آتا ہے جو ہر انسان کو میسر نہیں ہوتا۔ مظفر حنفی کے اشعار ایک طرف اگر ان کی تیکھی زبان اور کاٹ دار لہجے کی ترجمانی کرتے ہیں (جس کا نمونہ گزشتہ صفحات پر دیکھ چکے ہیں) تو دوسری طرف ان کی تخلیقی بصیرت کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ کچھ اور اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہم اپنے آبلوں سے راستے گلزار کرتے ہیں
ہمارے پاؤں پر قوس قزح بیکار گرتی ہے

نہ پوچھیے کہ یہ لہجہ کہاں کا حصہ ہے
 کھری زبان مرے جسم و جاں کا حصہ ہے
 ڈوب جاتا ہے یہاں تیرنا آتا ہے جسے
 وہ کبھی ناؤ تھی دریا لیے جاتا ہے جسے
 یاخی یاخی پکارتا ہوں میں
 ہے کوئی تیر مارنے والا
 نعرہ زن ہاتھ میں تلوار عدو ہے کہ اخی
 دیکھنا برسر پیکار عدو ہے کہ اخی
 حاجت مرے بدن کو ترے خون کی نہیں
 اے دوست لے رہا تھا ترا امتحان میں

رومان و محبت بھی ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ مفلس و غریب ہو یا امیر و رئیس، محبت ہر جگہ اپنا نشین بنالیتی ہے۔
 ہر دل میں اس کے تار بجتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں اظہار ہوتا ہے کہیں نہیں۔ شاعر جو حساس ذہن کا مالک ہوتا ہے، اس
 سے مبرا نہیں۔ آئیے مظفر خنی کے شعروں میں رومانی آہنگ تلاش کریں۔

وہ ظالم دیکھ لیتا ہے تو دل پر تیر چلتے ہیں
 پلک جھپکائے تو تلوار پر تلوار گرتی ہے
 کھل گئے پھول لفافے پہ ترے نام کے گرد
 رقص کرتا ہے قلم زیر و زبر میں کیسے
 وسعتیں مجھ کو خلاؤں سے صدا دیتی ہیں
 یہ نشین کی گرہ پڑ گئی پر میں کیسے
 وہ مسکرا رہے تھے کہ تصویر کھینچ لی
 کل رات ہم نے وقت کی زنجیر کھینچ لی
 نہایت عام ہو کر بھی وہ خاص الخاص ہے دل کو
 جسے ہم چاہتے ہیں اس کو شہزادی نہیں کہتے
 آج مظفر اپنا مقطع اس کی نذر کیے دیتے ہیں
 جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا کیا شعر عطا فرمایا

یہاں بھی مظفر صاحب دوسروں سے الگ نظر آتے ہیں۔ میدان کوئی بھی ہو، غزل کی روایات کی پاس داری کرتے
 ہوئے انھوں نے اپنی راہ سب سے ہٹ کر نکالی ہے اور میں سمجھتا ہوں یہی ان کا سب سے بڑا کمال ہے۔

غزل کی روایات اپنی جگہ
 ہماری کھری بات اپنی جگہ

صابر اقبال: ایک ہمہ جہت فنکار

آتش گل ڈائجسٹ (دہلی) نے اپنے ۱۹۹۴ء کے شمارے میں طرحی غزلوں کے مقابلے کا اعلان کیا۔ جگتدل سے صابر اقبال نے دی گئی طرح پر غزل لکھی اور ڈاک سے مدیر آتش گل کے پاس بھیج دی۔ مہینہ بھر بعد جب اگلے شمارے میں انعام جیتنے والوں کا نام شائع ہوا تو اہل نظر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اول انعام کا حق دار صابر اقبال کی غزل قرار پائی تھی۔ اہالیانِ جگتدل کے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ ان کے علاقے کا ایک نوجوان شاعر آل انڈیا پیانے پر شعر و سخن کا مقابلہ جیت چکا ہے۔ آناً فاناً رستم گمٹی جگتدل پر ایک استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ سیون اسٹار لائبریری کے اراکین کی جانب سے انعام یافتہ غزل کو خوبصورت فریم میں جڑ کر صابر اقبال کو پیش کیا گیا۔ انھیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عوامی سطح پر صابر اقبال کی شاعری قدر و منزلت کی لہروں سے ہم کنار ہوئی اور عوامی پسند کی سطح پر اشعار گنگنائے جانے لگے۔

مجھے کرتا پا بجولاں ، یہ نہ تھا فلک کو یارا
میں غلام اپنا نکلا مجھے خواہشوں نے مارا
رگ ربط ٹوٹے ہی گل و برگ منتشر ہیں
جو بھی مستقر سے چھوٹا ، وہ وجود اپنا ہارا
جو نظر ہو تہہ نشیں تو کھلے عکس کی حقیقت
کہے آئینہ کہاں کچھ پس پشت بولے پارا
بخدا لپک کے منزل کرے آپ پیشوائی
جو ہو خار دشتِ امکاں تجھے اک ذرا گوارا
نہ حروفِ دل جو ابھرے تو مراسلہ جلا کر
اسے راکھ بھیج ڈالی کہ ہو حال آشکارا
یہ ثنا پسند رفعت ہو زمانے کو مبارک
میں اگر ہوں زیرِ زینہ مجھے اپنا قد ہے پیارا
جو امینِ مصلحت تھے ہوئے سر کو رکھ سبک سر
مرے ذوقِ عشق نے ہے سر دار سر ابھارا
یہ سرشکِ زیست صابر ہے فسوں کا اک سمندر
کہ ہے ابتدا بھنور سے ، پہ ہے انتہا کنار

(صفحہ: ۱۲۹، آیاتِ سخن ۱۹۹۵ء)

افسوس کی بات یہ ہے کہ انھی دنوں صابر اقبال کے گھر چوری کا واقعہ ہوا۔ دیگر سامان (زیورات، نقدی، کپڑے)

کے ساتھ چورسپاس نامہ اور بیاض تک اٹھالے گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چوروں کا تعلق کسی ادبی گروہ سے تھا۔ آج بھی صابر اقبال کے دل پر یہ زخم تازہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلیں شرمندہ اشاعت نہ ہو سکیں۔ دوستوں کے اصرار پر اپنی یادداشت کے سہارے اپنی نظموں/غزلوں کو جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

کلکتہ کے مضافات میں ایسے شاعروں میں جنہوں نے مغربی بنگال کے ادب میں نمایاں اضافہ کیا ہے، ایک نام ارمان شام نگری کا بھی ہے۔ ارمان صاحب نے جرم محمد آبادی، شا کر کلکتوی، پرویز شاہدی جیسے اساتذہ فن سے کسب فیض کیا تھا۔ یہی کسب فیض ارمان شام نگری سے منتقل ہوتا ہوا صابر اقبال تک پہنچا۔ ۹ ستمبر ۱۹۹۲ء کو ارمان صاحب نے جن کی سرپرستی میں صابر صاحب اپنا شعری سفر طے کر رہے تھے، آنکھیں موند لیں۔ ذوق سلیم رہنمائی کو آگے بڑھا۔ وجدان نے بازو تھامے، ہمت و ارادے نے عزم مصمم کا درس دیا۔ اس زمانے میں کانگی نارہ و جگندل کی ادبی محفلوں پر حشم الرمضان، واقف رزاقی، وفا سکندر پوری، دل عرفانی، معصوم شرقی، نور اقبال چھائے ہوئے تھے۔ قمر پیامی اور یونس اثر بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ ہزل گوئی کے میدان میں جمیل احمد الہ آبادی اور انور بارود کا پرچم لہرا رہا تھا۔

۱۹۷۸ء میں صابر اقبال ادبی افتخار پر نمودار ہوئے۔ خاندانی نام صابر علی اور قلمی نام صابر اقبال ہے۔ پیدائش جگندل کی ہے۔ سنہ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۵۴ء ہے۔ والد محمد عمر انصاری اپنے وقت کی ایک دہنگ شخصیت تھے۔ غیر منقسم ہندوستان میں بارک پور سب ڈویژن سے مسلم لیگ کے سکریٹری کیا بنائے گئے، ساری عمر سکریٹری صاحب کے نام سے جانے گئے، پکارے گئے۔ آبائی وطن بلیا (یوپی) ہے۔ فی الحال ویسٹ بنگال اسٹیٹ الیکٹریسیٹی ڈسٹریکشن کمپنی لمیٹڈ میں ملازم ہیں۔ چونکہ بجلی کے محکمہ سے تعلق ہے اس لیے دماغ بھی بجلی کی طرح سرعت سے کام کرتا ہے۔

فن شاعری کے رموز و نکات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ مطالعہ و مشاہدہ نے اور بھی عمیق کر دیا ہے۔ ماضی میں کئی ادبی اداروں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ فی الحال کانگی نارہ و جگندل کی ادبی تنظیم ”قرطاس و قلم“ کے صدر ہیں اور نوجوان ذہنوں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی آن لائن اردو میگزین ”کائنات“ میں نائب مدیر کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے ہیں۔ اپنی بات کو منفرد انداز میں کہنے کا سلیقہ انھیں آتا ہے۔ آئیے ان کے کچھ اشعار پر نظر ڈالیں۔

وقار و حیثیت سود و زیاں کیا کیا پرکھتی ہے
محبت پہلے جیسی آج دیوانی نہیں ہوتی
مشاہدات کے شعلے ہیں ذہن میں روشن
ضعیفہ یوں ہی نہیں دل لگی سے جلتی ہے
کوئی زمین پہ اترے تو کوئی بات بنے
ہر ایک شخص ہے اپنے ہی آسمان میں قید
کسی بھی حال میں بیچا نہیں بڑی بی نے
نہ جانے کون سی دولت تھی پاندان میں گم
پورس کے خوددار لبوں سے ایسا جملہ ٹوٹ گیا
فاتح اعظم ہار گیا اور جیت کا نشہ ٹوٹ گیا

جذبوں کو لفظوں کا پیرا ہن دینا، ان میں تاثیر پیدا کرنا کہ سیدھے قلب میں اتر جائیں، صابر صاحب کو خوب آتا ہے۔ آج محبت کا ہوش مند ہونا محبوب کی حیثیت کو آنکنا، دھوپ میں سایہ کا دیوار سے زیادہ اہم ہونا، پھول سی بات کا تلوار سے زیادہ گراں گزرنا، تنقید کرتے ہوئے لوگوں کا معیار سے گرجانا، حسین چہروں کے محفل میں شامل ہونے پر خیالوں میں پاکیزگی کا فقدان ہونا، نظر کے تہہ نشیں ہونے پر عکس کا راز کھلنا، پس پشت پارے کا کمال دکھانا، آئینے کا خاموش رہنا، وغیرہ صابر صاحب کے خلافتانہ رویے اور بصیرت افروزی کی مثال ہیں۔

حسین چہرے جو شامل ہوں تو محفل خوب جہتی ہے
خیالوں میں مگر وہ پاک دامانی نہیں ہوتی
نوکِ خنجر چھو منوایا تو کیا بات ہوئی
بات تو جب ہے کہ تو بات سے قائل کردے
کم لباسی ملی کچھ وقت کی رفتار سے بھی
کچھ تو مجبور ہے وہ جسم کے اسرار سے بھی
ادب سے بات کرنی ہو تو آسانی نہیں ہوتی
غزل اتنی مہذب ہے کہ من مانی نہیں ہوتی

صابر اقبال کا انداز کچھ الگ، کچھ نیا نیا سا ہے جس نے شاعروں کی بھیڑ میں انھیں الگ کر دیا۔ ان کی الگ پہچان بنا

دی۔

رات گئے تک سینہ سپر تھا دیدِ سحر کے ارماں میں
لیکن صبح کارنگ جو دیکھا رفتہ رفتہ ٹوٹ گیا
صابر اقبال کی شاعری میں غم ذات اور کشمکشِ حیات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ انھیں اپنی ذات میں خامیوں کی موجودگی کا احساس ہے اور یہی چیز انھیں عظمت عطا کرتی ہے۔ چونکہ وہ شہر فساد کے مزاج سے نا آشنا ہیں اور سیاست کا مزاج ان دنوں انتہائی مبتدل ہو چکا ہے لہذا ان کی فریاد اور چیخ و پکار رائیگاں جاتی ہے۔

صابر اقبال نے قطعات بھی لکھے ہیں۔ اس میں بھی ان کا انفرادی رنگ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

جنتر منتر ، جادو وادو ، سب کچھ اپنی جیب
بھری رہے تو چار دشا میں بکتی ہے پازیب
خالی جیب کا بوجھ اٹھا کر من بھاری ہو جائے
چاند سی بیوی ، پھول سے بچے ، لگتے ہیں آسیب

غزلوں کے علاوہ صابر اقبال نے افسانے بھی لکھے، مضامین بھی۔ ان کا فسانہ ”احساس کی واپسی“ ۱۹۷۱ء میں روہی (دہلی) کے مئی کے شمارے کی زینت بنا۔ ان کا مضمون جو انور شیخ کی کتاب ”بھض جہاں“ پر لکھا گیا اور انشاء کلکتہ میں چھپا، گواہ ہے کہ مضمون انفرادی نوعیت کا ہے اپنے مدلل نکتوں اور اثر افربنی کے باوصف اعتبار کا درجہ رکھتا ہے۔

صابر اقبال نے ادبی کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔ ان کے تبصرے اب تک دستک (ہوڑہ)، رنگ (دھنبا)، اثبات

ونفی (کلکتہ)، انشاء (کلکتہ)، کائنات (جکندل) میں چھپ چکے ہیں اور قارئین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔
درجنوں لکھے گئے تبصروں میں کالیداس گپتا رضا جیسی شخصیت کے نظموں کے مجموعہ ”نظم سمندر“ پر کیا گیا تبصرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انداز بیان ملاحظہ ہو۔

”یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ عمر کی ریشمی ڈور جوں جوں ہاتھوں سے پھسلتی جاتی ہے، خیالوں میں چستی، فکر کی توانائی اور فن میں شباب در آتا ہے۔ سروں پر برف کے گالے اترتے ہیں تو شعور کی آنچ کچھ اور سوا ہو جاتی ہے۔ اس دعوے کی صداقت میں پیش ہے کالیداس گپتا رضا کی نظموں کا انتخاب۔ نظم سمندر“
(صفحہ ۳۱۱: دستک-۵، مدیر عنبر شمیم)

جس طرح کسی مصور کی ایک ہی تصویر شاہکار کا درجہ پا کر اسے زمانے بھر میں مشہور کر دیتی ہے۔ ایک افسانہ نگار کا قاعدے سے لکھا ہوا ایک ہی افسانہ اسے زندہ و جاوید بنا دیتا ہے۔ ایک شاعر کو اس کی ایک ہی غزل زندہ رکھتی ہے۔ صابر اقبال جیسے شاعر کو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے ان کا ایک شعر ہی کافی ہے۔

ادب سے بات کرنی ہو تو آسانی نہیں ہوتی

غزل اتنی مہذب ہے کہ من مانی نہیں ہوتی

انور شیخ پر لکھا گیا مضمون بڑے بڑے اہل قلم سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ رکھتا ہے

کالیداس گپتا رضا پر کیا گیا تبصرہ خود بول اٹھتا ہے کہ یہ فنکار اپنی نوعیت کا انوکھا فن کار ہے۔ یہ لفظوں کو زبان دیتا ہے لہذا ادب میں اس فنکار کا زندہ و جاوید ہونا اس کا حق و اجبی ہوگا۔

قیوم بدر: طنز و مزاح کا ایک منفرد نام

مزاح کے لیے ذہانت اور طنز کے لیے مشاہدہ و تجربہ نہایت ضروری ہے۔ قیوم بدر ۱۹۷۱ء سے لکھ رہے ہیں۔ تقریباً بیس برسوں کے بعد ان کے طنز و مزاح کا پہلا مجموعہ ”دخل در معقولات“ کے نام سے منصہ شہود پر آ کر قارئین ادب سے داد و تحسین وصول کر چکا ہے۔ دس سال کے بعد دوسرا مجموعہ ”ہم قبرستان سے بول رہے ہیں“ منظر عام پر آیا ہے۔ اس دوران ان کا قلم نہ صرف متحرک رہا ہے بلکہ انھوں نے عالمی سطح پر بھی اپنی پہچان بنائی ہے۔ ظاہر ہے مسلسل مشق سے نہ صرف فن پران کی گرفت مضبوط ہوئی ہے بلکہ طنز و مزاح میں گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہوئی ہے جس کا اعتراف ملک اور بیرون ملک کے اہل فن نے کیا ہے۔ معروف طنز و مزاح نگار محبتی حسین نے اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔ ”قیوم بدر کے مزاح میں شائستگی بھی ہے اور ندرت بھی۔“ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں اس میں ناہمواریاں زیادہ ہیں۔ عام آدمی اس کو جھیلتا ہے۔ ان سے الجھتا اور پھر درگزر کر جاتا ہے۔ قیوم بدر ان میں الجھنے کے بجائے ان معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا کر کے عوام کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ عوام کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور یہی ان کے فن کا کمال ہے۔ ”کہتے ہیں ادب میں اعتبار اور وقار کی خاطر ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ کم وقتوں میں ان چیزوں کی ضرورت ہو تو اپنی جیب خاص سے اردو کا ایک رسالہ نکال دیجیے۔ اگر صلاحیت ہے تو سونے پر سہاگہ۔ اگر نہیں ہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ادباء و شعراء مکھن لگا کر اس کمی کو پورا کر دیں گے۔“

(مکھن کے فائدے)

طنز و مزاح کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت پڑتی ہے، وہ ہے انسانی نفسیات کا مطالعہ۔ اہل نظر میں پیشتر کی رائے ہے کہ قیوم بدر کی تحریریں نہ صرف زمین سے جڑی ہوتی ہیں بلکہ گرد و پیش کے حوالے سے رنگ و بو اخذ کرتی ہیں۔ واقعہ نگاری میں وہ ایسا موقع ابھارتے ہیں کہ قاری ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ رشید احمد صدیقی کی پیروی کرتے ہوئے شعر و ادب سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

”دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو“ (شادی سے پہلے یا شادی کے بعد)

اور کبھی بطرس بخاری کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ظریفانہ واقعہ نگاری سے۔

زندگی کا کوئی شعبہ کرپشن سے پاک نہیں۔ شعبہ تعلیم بھی اس سے مبرا نہیں۔ یونیورسٹی کی ڈگری حتیٰ کہ پی ایچ ڈی کا حصول بھی آسان ہو گیا ہے جس سے قلم کار خصوصاً طنز و مزاح کا قلم کار صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں دو چھوٹے سے جملے قیوم بدر کے مشاہدے کا غماز ہیں۔

”زندوں پر پی ایچ ڈی مردے کرتے ہیں۔“ (شرط مرنے کی لگادی)
 ”یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ڈگریوں کی تقسیم سے جہاں ان کی تو قیر دن بہ دن گھٹتی جا رہی ہے، وہیں متعدد خرابیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں جس میں اہم خرابی یہ ہے کہ ادب میں بے راہ روی کا چلن زور پکڑتا جا رہا ہے۔“
 (مرض بڑھتا گیا.....)

بقول قمر نقوی نقشبندی (مدیر روشنی، نیویارک، امریکہ)

”قیوم بدر کے مضامین میں شائستگی اور وقار ہوتا ہے۔“

سچ پوچھیے تو طنز و مزاح کے لیے ان خصوصیات کی موجودگی ناگزیر ہے ورنہ وہ طنز و مزاح نہیں پھکڑ پن کہلائے گا۔
 بقول وجاہت علی سندیلوی نکاح کی طرح مزاح میں بھی مزاح نگار اور قاری کے درمیان ایجاب و قبول کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور جب تک دل قبول نہ کرے بات بنتی نہیں۔ قیوم بدر نے نہ صرف بات بنائی ہے بلکہ نبھائی بھی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ قاری بے ساختہ بول اٹھتا ہے۔

رہنے دوا بھی ساغر و مینا مرے آگے

مسائل اور مصائب کی جکڑ بندیوں میں گرفتار جدید دور کے انسان کے لیے لمحہ طرب مداوائے رنج الم سے کم نہیں۔ دنیا میں بہت سارے مصنوعی ذرائع ہنسنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں لیکن جو بات ایک طنز و مزاح نگار کے اختیار میں ہے وہ مصنوعی ذرائع میں کہاں؟ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو خواہ مخواہ ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قیوم بدر کا یہ جملہ دیکھیے۔
 ”کتے ہمارے مہذب ہونے کی علامت ہیں بلکہ کئی قومیں محض کتوں کی بدولت مہذب ہونے کا دعویٰ پیش کرتی ہیں۔“

اب اگر کوئی شخص کتا پالنے کا شوق رکھتا ہو تو مذکورہ بالا جملہ پڑھ کر تلملے گا ضرور لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بھی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں یہی مسکراہٹ قیوم بدر کی کامیابی کا ثبوت ہے۔
 مزاح نگاری کے چند اور نمونے ملاحظہ ہوں۔

”پہلے جنس سے جنس تبدیل ہوتی تھی۔ اب سائنس کے اس دور میں جنس بھی تبدیل ہونے لگی ہے۔“

(تبادلہ خیال)

”زندگی میں ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں ہر شریف آدمی کو بکرا بننا پڑتا ہے۔“ (کالونی کا بکرا)

”پہلے یہ مخلوق خال خال نظر آتی تھی لیکن اب ان کی تعداد مرض اور مریض دونوں سے تجاوز کر گئی ہے۔“

(سو وہ بھی ہے ڈاکٹر)

”پہلے لوگ لڑکیوں کا ہاتھ مانگتے تھے اب جہیز“

”ان کی محبت اور خلوص دیکھ کر میرے دل میں شک گزرا کہ ہونہ ہو ہمارا سابقہ غلط آدمی سے پڑ گیا ہے۔“

”پہلے کی نسبت آج کا انسان کپڑے پہن کر زیادہ ننگا ہے۔“

ماضی میں قیوم بدر ”صدف“ (سالانہ میگزین سیون اسٹار لائبریری) جکتدل اور ”کائنات“ (آن لائن الیکٹرونک اردو میگزین، جکتدل) کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔ انھیں لفظوں کو برتنے کا سلیقہ بھی ہے اور تجربہ بھی۔ ”خاکے“ بھی لکھے تو خوب لکھے جو طنز و مزاح کا ایک منفرد اسلوب ہے۔

بیسویں صدی میں جن فنکاروں نے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان میں فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور کے نام مشہور ہیں۔ بعد ازاں ابن انشاء، فکر تو نسوی، مشتاق احمد یوسفی، پرکاش پنڈت، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، سالک لکھنوی، معین قریشی وغیرہ کا نام آتا ہے جن کے فن پارے اس صنف کے وقار میں اضافہ کا باعث بنے۔

مذکورہ بالا تمام لکھنے والوں سے قیوم بدر نے بھرپور استفادہ کیا ہے اور اپنی ایک الگ راہ بنائی ہے۔ ”دخل در معقولات“ میں ان کے یہاں طنز سے زیادہ مزاح پایا جاتا ہے۔ دوسرے مجموعے ”ہم قبرستان سے بول رہے ہیں“ میں شخصیات پر آزادانہ اظہار خیال اور بر محل محاورے سے بڑا بانگن آ گیا ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی کے ساتھ شوخی کا پایا جانا، ارد گرد کے ماحول سے موضوعات کا انتخاب کرنا اور ان کے وسیلے سے قلم کی جولانیاں دکھانا، انسانی زندگی کے بوجھل لمحات کو کم کرتا ہے جو ایک مستحسن اقدام ہے۔ المختصر تصانیف سے لطف اٹھانے کا ہنر قیوم بدر کو خوب آتا ہے۔ اسی بنا پر میں انھیں ایک منفرد طنز و مزاح نگار تسلیم کرتا ہوں۔

ظن سرسید حکیم عبدالقادر

کلکتہ سے تقریباً چالیس کیلومیٹر کی مسافت پر واقع کانکی نارہ ضلع شمالی چوہیس پرگنہ کی آبادی میں بسا ہوا حمایت الغرباء ہائی اسکول یقیناً ایک مینارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اپنے علاقے کا سب سے پرانا اسکول ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل علم کے پروانے ہندوستان کے مختلف گوشوں اور بیرون ملک بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ اس اسکول کی بنیاد حکیم عبدالقادر صاحب نے ڈالی تھی۔ بلاشبہ حکیم صاحب اپنے وقت کا سرسید کہلانے کے مستحق تھے۔

ادب اور صحافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ناظر الحسینی کا نام یقیناً نا آشنا نہیں ہوگا۔ ان کا شمار کلکتہ کے ممتاز اور کہنہ مشق شعراء میں ہوتا تھا۔ صحافت کے سلسلے میں وہ کلکتہ کے معروف اخبارات روزانہ ہند، عصر جدید، آزاد ہند سے منسلک رہ چکے تھے۔ اسی ناظر الحسینی کے والد ماجد حکیم عبدالقادر تھے۔

لگ بھگ ۱۹۲۸ء میں حکیم عبدالقادر کانکی نارہ وارد ہوئے۔ رہائش کے لیے منبوسر دار کا محلہ انتخاب میں آیا۔ حکیم صاحب بڑے علم دوست تھے۔ وہ کانکی نارہ کی بستی میں علم کی شمع جلانا چاہتے تھے۔ یہ علاقہ اس وقت بہت ہی نازک دور سے گزر رہا تھا۔ فضا میں انقلاب زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ انگریزی سرکار انقلابیوں سے برسرِ پیکارتھی۔ یہ ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔ نامساعد اور پر آشوب دور میں جب کہ چاروں طرف اغیار کی سازشیں اور ارباب کی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں، حکیم عبدالقادر صاحب نے ”حمایت الغرباء“ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس نیک کام کے لیے محمد اسماعیل میاں عرف کھساری میاں اور نور محمد صاحب (ماسٹر سرفراز احمد کے والد) نے جگہ عنایت کی۔ اس مدرسہ کے پہلے مدرس حکیم صاحب خود ہوئے اور دوسرے مدرس ماسٹر حسام الدین (ماسٹر ابوالقاسم انصاری کے والد) ہوئے۔ یہی مدرسہ آگے چل کر حمایت الغرباء پرائمری اسکول بنا، پھر مڈل اور آج ہائر سکندری اسکول کا درجہ حاصل ہے۔

حکیم صاحب نہایت ہی مخلص اور وضع دار انسان تھے۔ ان کے اندر علم دوستی، ادب نوازی، غریب پروری، فراخ دلی اور عالی ہمتی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ان کی خدمات آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ حمایت الغرباء ہائی اسکول ان کے ایثار اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ اس اسکول کو قائم کرنے میں بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اسکول کی پہلی مجلس منظمہ کا انتخاب ۱۹۴۵-۴۶ء میں ہوا۔ مولوی لطافت حسین صدر بنائے گئے اور محمد اسماعیل نائب صدر ہوئے۔ حکیم صاحب کے کاندھوں پر سکریٹری شپ کی ذمہ داریاں ڈالی گئیں۔ مبارک سردار، ابوالحسن سردار، محی الدین سردار، حاجی دل محمد اور محمد عمر ممبر منتخب ہوئے۔ ٹیچر کے نمائندہ سپنچر داس بنائے گئے۔

۱۹۴۵-۴۸ء کے لیے دوسری کمیٹی کا انتخاب ہوا۔ اس وقت ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ پہلی کمیٹی کے نائب صدر محمد اسماعیل پاکستان جا چکے تھے۔ کمیٹیوں کے بننے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۸-۵۲ء، ۱۹۵۲-۵۳ء، ۱۹۵۳-۵۴ء اور ۱۹۵۴-۵۶ء

علم کا قافلہ آگے بڑھتا رہا
لوگ آتے رہے، لوگ جاتے رہے

کمٹیاں بنتی بھی رہیں اور بدلتی بھی رہیں مگر حکیم عبدالقادر صاحب نہیں بدلے۔ ہر نئی کمیٹی میں وہ سکرٹری منتخب کیے جاتے رہے۔ تقریباً ۱۶ برسوں تک اس ادارہ کو انھوں نے اپنے اصولوں پر چلایا۔

بعد کے معاون ساتھیوں میں رام نریش چوہے (سابق ہیڈ ماسٹر) کا نام آتا ہے جن کا اسکول کے طلباء پر بڑا دبدبہ تھا۔ تقریباً آٹھ برسوں تک انھوں نے اسکول کی خدمت کی اور اپنے مطابق سنوارا۔ ۱۹۶۵ء سے محمد ایوب انصاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے اور تقریباً پینتیس سال انھوں نے اسکول کی خدمت کی۔ حکیم صاحب کے خوابوں کو ایک حسین رنگ عطا کیا اور رعنائی بخشی۔

حکیم عبدالقادر ایک سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ سیکولر ایجوکیشن کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد (مشن) بنایا تھا۔ آج سیکولر مشن پوری طرح سے اسکول میں برقرار ہے۔ نہ صرف برقرار ہے بلکہ پورے آب و تاب کے ساتھ اس کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ ہر طبقہ کے بچے بلا امتیاز مذہب و ملت اس چشمہٴ علم سے سیراب ہو رہے ہیں۔ فی الحال کنچڑا پاڑہ، حاجی نگر، گوری پور، جگتدل، شام نگر، تیلنی پاڑہ، چا پدانی، بارک پور، ٹیٹا گڑھ کے علاقوں سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے کا نئی نارہ حمایت الغریب ہائی اسکول کا رخ کرتے رہتے ہیں۔ یہ درس گاہ اپنے ہر چاہنے والے پر علم کے موتی لٹاتی رہتی ہے۔ یہی اس کا امتیازی پہلو بھی ہے اور گنگا جمنی تہذیب کی پہچان بھی۔ اس کا دامن ہر مکتب فکر کے لوگوں کے لیے پھیلا ہوا ہے۔

اس مضمون کے وسیلے سے حکیم عبدالقادر جیسی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنا اولین مقصد ہے جن کی ان تھک کوششوں سے یہ منارہٴ نور عالم وجود میں آیا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ اسکول ان لوگوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے جو مذہب کو سیاست، تعلیم اور عام آدمی کی روزمرہ زندگی سے جوڑ کر اپنا الوسیدھا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ خاکسار کو اس بات پر فخر ہے کہ اسی مینارہٴ نور سے اس نے فیض حاصل کیا ہے۔

اسکول کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۹۶۷ء میں شری بچے سنگھ نہار (وزیر محنت، حکومت مغربی بنگال) کے ہاتھوں رکھا گیا اور ۲۴ مئی ۱۹۶۸ء کو نئی عمارت کا افتتاح مغربی بنگال کے مشہور و معروف شاعر حشم الرضوان کے قلم نے ”مذہبیت الغریب“ کے عنوان سے چند قطعات کو جنم دیا تھا۔

درس گاہ حمایت الغریب ہم نے اس دم بھی تجھ کو دیکھا ہے
ٹاٹ پر جب ترا بسیرا تھا آج محل پہ تیرا ڈیرا ہے

درس گاہ حمایت الغریب مان اس دم بڑا ہوا تیرا
شری بچے سنگھ نہار کے ہاتھوں سنگ بنیاد جب پڑا تیرا
۱۳ جولائی ۱۹۹۱ء کو ”حکیم عبدالقادر منچ“ کا افتتاح مغربی بنگال کے وزیر صنعت و تجارت شری بدوت گنگولی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر وزیر موصوف نے حکیم صاحب کی کوششوں کو سراہا اور انھیں ایک نمونہ (Ideal) بتایا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس آئیڈیل کو ہر آدمی اپنی زندگی کا آئیڈیل بنالے۔ یہی طریقہ صحیح معنوں میں حکیم عبدالقادر کی روح کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ ہوگا۔

ماسٹر عبدالمجید انصاری (سائنس ٹیچر، جو بعد میں ٹیٹا گڑھ انجمن غریب المسلمین کے ہیڈ ماسٹر بنے) نے افسانوی

انداز میں ”کہانی فقیر کی کنیا کی“ لکھ کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ یہ مضمون اپنی جگہ پر خوب ہے اور حکیم عبدالقادر کے بہت سارے مخفی گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

شعبۂ اردو کے استاد عبدالغفار انصاری (جو ادبی دنیا میں ڈاکٹر معصوم شرقی کے نام سے مشہور ہیں) نے بہت ہی اچھے ڈھنگ سے حکیم عبدالقادر صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

یہ دانش گاہ حکمت مرکز علم و فراست ہے
نظر کے سامنے اس کی غریبوں کی حمایت ہے
یہ دانش گاہ ہے اک یادگار حضرت قادر
یہ ہے دریا دلی ان کی ، یہی ان کی سخاوت ہے

ہر اسکول کی ایک روایت ہوا کرتی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر اسکول کا قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ حکیم عبدالقادر صاحب نے فخر ملت سرسید احمد کا جام پی لیا تھا اور اس جام کی لذت وہ آخر دم تک محسوس کرتے رہے۔ اس احساس کو وہ کانگی نارہ والوں تک منتقل کر دینا چاہتے تھے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے جیسی تو ماسٹر ادریس الفاروقی (مرحوم) نے ”حکیم عبدالقادر“ کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر ان کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

علم کا پیکر

ادب کا ہم نوا

اور تو تہذیب کا ہمسایہ تھا

تو نے دیکھا جہل و گمراہی کے بھیانک غار کے منہ پر تری

قوم ہے گم سم کھڑی

اے مجاہد!

تجھ پہ پھر روشن ہوا سرِ عمل، رمزِ یقین

اور پھر

تو نے رنگ و بو سے ہٹ کر

عزم کا تیشہ لیا

اور پھر اک ضرب سے

اک ایسا چشمہ علم کا جاری کیا

جس سے لاکھوں ذہن کی کالک دھلی

پی لیا تھا تو نے سرسید کا جام

اے نقیب علم و فن تجھ کو سلام

نظم کیا ہے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ایسی نظم لکھنے کے لیے ادریس الفاروقی یقیناً مبارک باد کے مستحق

ہیں۔

سر سید کا دائرہ کار پورا ہندوستان تھا۔ وہ وسیع کینوس پر اپنا کام کر رہے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنے لیے محدود میدان چنا تھا۔ کانکی نارہ کا علاقہ اور وہ اس میں تنہا تن من دھن سے لگ گئے۔ کامیابی و کامرانی ان کے حصے میں آئی۔ انھوں نے ۷۰-۷۲ سال قبل علم کا جو پودا لگایا تھا، آج وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے جس کے سائے میں لگ بھگ ساڑھے تین ہزار تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔ صحیح معنوں میں وہ سر سید احمد کا سایہ تھے اور انھیں بجا طور پر ظنِ سر سید کہا جاسکتا ہے۔ باشندگانِ کانکی نارہ پر حکیم صاحب کا یہ ایک ایسا قرض ہے جس سے وہ تاعمر سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

حافظ علی حسین

ایک امام، ایک استاد، ایک طالب علم

میرے سامنے روزانہ عصر جدید کلکتہ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۷ء کا ایک تراشہ رکھا ہوا ہے۔ اس تراشے میں جامعہ اردو علی گڑھ کے کلکتہ مرکز کے امتحان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی ایک فہرست چھپی ہے جس میں ادیب ماہر رول نمبر ۱۰۰۲ کے تحت حافظ علی حسین کا نام درج ہے۔ اس نام پر نظر پڑتے ہی ذہن میں بہت ساری یادیں گڈمڈ ہونے لگی ہیں۔ دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچ گئی ہے۔ دل کا اصرار ہے کہ حافظ صاحب سے متعلق یادوں کے جگنوؤں کو منظر عام پر لایا جائے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ آدمی پہلے طالب علم بنتا ہے پھر استاد۔ حافظ علی حسین صاحب اس قاعدے سے مستثنیٰ تھے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو استاد ہوتے ہوئے بھی تشنگی علم کا احساس رکھتے تھے اور اس کے حصول کے لیے دم آخر تک تگ و دو کرتے رہے۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک نام حافظ علی حسین (مرحوم) کا بھی ہے۔ عصر جدید کے مذکورہ بالا تراشے میں ابتدائی امتحان کے امیدواروں کے تحت تین نام اور بھی درج ہیں۔

رول نمبر: ۶۸۷ عبد الوہاب انصاری

رول نمبر: ۶۸۸ محمد عین الحق انصاری

رول نمبر: ۶۸۹ محمد قمر الزماں انصاری

حافظ صاحب نے اپنی خاص نگرانی میں ان تینوں امیدواروں کو ابتدائی امتحان ۱۹۵۷ء کے لیے تیار کیا تھا اور اپنے ساتھ (جامعہ اردو علی گڑھ کے کلکتہ مرکز) لے گئے تھے۔ تین دنوں تک مفید الاسلام لین، کلکتہ-۱۴ میں قیام بھی کیا تھا۔ اس وقت ان تینوں کی عمر آٹھ سے دس سال کے درمیان تھی۔ امتحان والے دن ان کو مطلوبہ نشست پر بٹھا کر حافظ صاحب خود ادیب ماہر کے امتحان میں شریک ہوئے تھے۔ نتیجہ نکلا، کامیاب بھی رہے تھے۔ علم کی حصولیابی کا ایسا جذبہ بہت کم دیکھا گیا ہے۔ دوسری مرتبہ ۱۹۵۸ء میں ادیب کے امتحان کے دوران بھی وہی منظر دیکھنے کو ملا جب وہ امتحان گاہ میں ہم لوگوں کو پہنچا کر خود ادیب کامل کے لیے دوسرے روم میں چلے گئے تھے۔ اس طرح پڑھتے پڑھاتے ادیب کامل کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

تیسری بار یہ منظر برسوں بعد دکھائی دیا۔ یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ راقم الحروف اس وقت حمایت الغرباء ہائی اسکول (کانکی نارہ) سے اسکول فائنل کا امیدوار تھا۔ حافظ صاحب اردو اور فارسی کے کلاسیس لیتے تھے۔ حیرت اس وقت ہوتی تھی جب کلاس ختم ہونے کے بعد حساب یا انگریزی والے پریڈ میں حافظ صاحب خود بھی ایک طالب علم کی طرح کلاس میں بیٹھ جاتے تھے (یہاں ہم لوگوں سے مراد ماسٹر شمس الزماں انصاری، ماسٹر ابوالقاسم انصاری و دیگر احباب ہیں)۔ اللہ کی شان اسکول فائنل امتحان ۱۹۶۴ء کا سنٹر بھاٹ پاڑہ ہائی اسکول بنا۔ حافظ صاحب بھی اس امتحان میں شریک ہوئے اور کامیابی کی سند حاصل کی۔ یہ تیسرا امتحان تھا جو انھوں نے طالب علم کی حیثیت سے طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر دیا۔ اس طرح حافظ صاحب کی

شخصیت اور بھی محترم ہوگئی۔

حافظ صاحب کو اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس کے جوابات حفظ کر لیتے تھے جو امتحان کے زمانے میں کام آتے تھے۔ انگریزی اور حساب انھوں نے اپنی محنت، لگن اور شوق کے بل بوتے پر سیکھا۔ بس علم کی پیاس تھی جو انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ یہی جذبہ انھیں ملکہ یونیورسٹی کے دروازے تک لے گیا۔ پری یونیورسٹی آرٹس کے امتحان میں بھی کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔

بی اے اور ایم اے (فارسی) کا شوق انھیں درجہ تک لے گیا۔ ۱۹۸۶ء میں وہ ایم اے (فارسی) کی سند سے نوازے گئے۔ اس زمانے میں حافظ صاحب ہم لوگوں کے لیے ایک مثال بن گئے تھے۔ آج راقم کو اردو، فارسی یا عربی کی جو تھوڑی بہت شد بد حاصل ہے وہ حافظ صاحب کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ آج کے کمرشیل دور میں اس طرح کے پڑھنے پڑھانے والے استاد کہاں ملتے ہیں؟ اتنی ساری مصروفیات کے باوجود رمضان کے مہینے میں حافظ صاحب مسجد اسحاق سردار واقع نیا بازار کا نکی نارہ میں پورے مہینے تراویح کی نماز بھی پڑھاتے تھے۔ اس مسجد سے ان کا رشتہ بہت پرانا تھا۔

غالباً ۱۹۵۲ء کا زمانہ تھا۔ فکرِ معاش حافظ علی حسین کے لیے بلیا (یوپی) سے کانکی نارہ وارد ہونے کا سبب بنی تھی۔ باشندگان کانکی نارہ کے لیے حاجی محمد اسحاق سردار (مرحوم) نے ایک مسجد تعمیر کروائی تھی جو آج مسجد اسحاق سردار کے نام سے مشہور ہے۔ اسی مسجد میں حافظ صاحب امام مقرر کیے گئے۔ بعد ازاں حمایت الغرباء ہائی اسکول (کانکی نارہ) سے منسلک ہوئے اور آپ کی تقرری بحیثیت اردو معلم ہوئی۔ صبح کے وقت آپ مسجد میں بیٹھ کر بچوں کو دین کی تعلیم سے آراستہ کرتے اور دن کے وقت اسکول جا کر دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور کرتے۔ محلہ میں سیرت کی مجلسوں میں اکثر بلائے جاتے۔ شادی بیاہ کی تقریبات ان کی شرکت کے بغیر نامکمل رہتیں۔ گزشتہ ۲۶ مئی ۱۹۶۸ء کو حمایت الغرباء ہائر سکندری اسکول کی نئی عمارت کا افتتاح جن دو شخصیتوں کے ہاتھوں عمل میں آیا ان میں ایک نام حافظ علی حسین صاحب کا بھی تھا جو ایک اعزاز کی بات تھی۔

موت برحق ہے لیکن کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آسمان بھی کفِ افسوس ملتا ہے۔ حافظ صاحب کی موت بھی ایسے حالات میں ہوئی جو کسی المیہ سے کم نہیں۔ ۱۳ جون ۱۹۸۸ء کو بوڑھہ دہلی اکپریس سے بلیا جاتے ہوئے ٹرین میں حرکت قلب بند ہونے کے سبب حافظ علی حسین کا انتقال ہو گیا (ان اللہ وانا الیہ راجعون)۔ حافظ صاحب اپنی چھوٹی لڑکی کی شادی رحمت نگر (دھنباڈ) میں طے کر چکے تھے۔ گرمی کی چھٹیوں میں شادی کا ضروری سامان، نقدی زیورات لے کر جا رہے تھے کہ کچھ شریک ان کے پیچھے لگ گئے۔ نشہ آور سگریٹ کے دھوئیں سے ان کا سر چکرا گیا۔ وہ بیہوش ہو گئے۔ اسی درمیان شریک اپنا کام کر گئے۔ زیورات، نقدی اور بکس لے کر بکسر سے پہلے ہی شریک اتر گئے۔ بکسر میں حافظ صاحب کو ہوش آیا۔ سامان وغیرہ غائب پا کر ان پر دل کا دورہ پڑا۔ حرکت قلب بند ہوگئی۔ گاڑی کا پنیور پینچی۔ جی آر پی کے ذریعہ حافظ صاحب کے انتقال کی خبر کانکی نارہ پہنچی۔ جس نے بھی سنا، کفِ افسوس مل کر رہ گیا۔ کانپور میں ہی حافظ صاحب کے مردہ جسم کو کانپور کرنیل گنج کی مسلم لاوارث میت انتظامیہ کمیٹی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح سے حافظ صاحب کا جسدِ خاکی کانپور کی سرزمین میں دفن کر دیا گیا۔ حافظ علی حسین (مرحوم) نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ کانکی نارہ میں گزارا تھا۔ کیا خبر تھی کہ انھیں یہاں کی خاک اور دو گز زمین بھی نصیب نہ ہوگی۔ ان کی بے وطنی خون کے آنسو رلاتی ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آزاد مردوں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔ وہ کسی خطے کے غلام یا قیدی بن کر نہیں رہتے۔

عبدالرزاق شاکی

کانکی نارہ کی ایک اہم ادبی شخصیت

جب بھی شعر و سخن کی بات اٹھتی ہے، ہمارے لبوں پر بے ساختہ جن دبستانوں کا نام آ جاتا ہے وہ ہیں دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی۔ ان دونوں دبستانوں کے بعد عظیم آباد اور پھر کلکتے کا ذکر بھی لازمی ہے۔ کلکتہ ایک طرف اپنے انقلاب آفریں نعروں اور جلسہ و جلوس کے لیے شہرت رکھتا ہے تو دوسری طرف شعر و سخن بھی اس کی تہذیبی وراثت کا خاصہ رہا ہے۔ نہ جانے کتنے آفتاب و ماہتاب کلکتہ کی سرزمین سے اٹھے اور اپنی روشنی سے دنیائے شاعری کو منور کر گئے۔

اسی کلکتہ سے تقریباً چالیس کیلومیٹر دور کانکی نارہ جو ضلع چوہیس پرگنہ کے شمال کی ایک دور افتادہ بستی ہے، نہ صرف اپنی سخن فہمی و سخن سنجی کے لیے مشہور ہے بلکہ شعر و ادب کی آبیاری کے لیے بھی بڑی زرخیز واقع ہوئی ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ زاہد حسین جسے ادبی دنیا جو ہر غازی پوری کے نام سے جانتی ہے، نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسی کانکی نارہ کی بستی سے کیا تھا اور ان کی جوانی کے حسین لمحات یہیں گزرے تھے۔ سید ناظر الحسنی کی شاعری کی ابتدا بھی کانکی نارہ میں ہوئی تھی۔ سید ناظر الحسنی کے والد کا نام حکیم عبدالقادر تھا جنہوں نے کانکی نارہ حمایت الغرباء ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی تھی جو آج ایک پر شکوہ ہائر سکولری اسکول میں تبدیل ہو چکا ہے اور قرب و جوار کے تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھا رہا ہے۔ کانکی نارہ کی سرزمین آج بھی شعر و ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس مضمون کا مقصد کانکی نارہ کی ایک اہم ادبی شخصیت حضرت عبدالرزاق شاکی سے ادبی دنیا کو روشناس کرانا ہے۔

حضرت عبدالرزاق شاکی کا شمار کانکی نارہ کے استاد شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا پورا نام عبدالرزاق اور تخلص شاکی ہے۔ پہلے شاکی تخلص کرتے تھے مگر جب پتہ چلا کہ ناظر اور شاکی پہلے سے ادبی دنیا میں موجود ہیں تو شاکی لکھنا ترک کر دیا اور خود کو شاکی لکھنے لگے۔ پیدائش کانکی نارہ کی ہے اور سنہ پیدائش ۱۹۱۰ء ہے۔

بتدریج تعلیم مدرسہ فیض الغرباء کانکی نارہ میں مولانا حبیب الرحمن صاحب کی نگرانی میں حاصل کی جو اس وقت کے ایک جید عالم تھے۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم شاکی صاحب نے انہیں سے حاصل کی۔ شاکی صاحب کا کوئی دیوان یا مجموعہ کلام دستیاب نہیں۔ جو کچھ بھی انہوں نے لکھا۔ حالات کی ستم ظریفیوں کی نذر ہو گیا۔ متعلقین و ہمدردین سے جو بھی اشعار دستیاب ہو سکے انہیں اس مضمون میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

تقریباً بیس سال کی عمر میں شاکی صاحب عروس سخن کی زلفوں کے اسیر ہوئے۔ دراصل بیس بائیس سال کی عمر خطرناک ہوا ہی کرتی ہے۔ اس عمر میں انسان کسی نہ کسی شوق میں گرفتار ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی روگ مدوائے زیست بن ہی جاتا ہے۔ سو حضرت شاکی شاعری کا روگ لگا بیٹھے۔ ان دنوں کانکی نارہ میں کجری اور قوالی گانے والوں کا بہت زور تھا۔ لوگ دلچسپی کے ساتھ کجری اور قوالی سنتے تھے۔ شاکی صاحب نے ماحول کا اثر قبول کیا اور کجری/قوالی لکھنے لگے۔ قوال حضرات

محفلوں میں پڑھتے اور خوب داد وصول کرتے۔

غزلوں کی طرف شاکی صاحب کی توجہ غالباً ۱۹۴۰ء میں مبذول ہوئی جب ان کی عمر ۳۰ سال ہو چکی تھی۔ اس وقت کانکی نارہ میں حضرت آرزو سہارن پوری کے شاگردوں میں ایم جی مصطفیٰ خلش، سراج بابو اور سلیمان بابو کی شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ وہ بھی متاثر ہوئے اور ماسٹر حسام الدین و عبدالب کی تحریک پر پہلی غزل کہی۔ طرح دی گئی تھی۔

لب بام ہے آفتابِ محبت

حضرت شاکی نے گرہ لگائی۔

منور ہوئی جاتی ہے دل کی دنیا

لب بام ہے آفتابِ محبت

۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا۔ ایم جی مصطفیٰ خلش نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی انجمن کے تحت کانکی نارہ کی سرزمین پر پہلی بار ایک طرحی مشاعرہ ۳۱ مئی ۱۹۴۱ء کو منبہ دسردار کے محلہ میں ہوا تھا جس میں گردنواح کے علاوہ مکنتہ و ہوڑہ کے نامور شعراء بھی شریک ہوئے تھے۔ ماسٹر مظہر الحق صاحب نے اس مشاعرے کی صدارت فرمائی تھی۔ طرح دی گئی تھی۔

قاتل پکارتا ہے کہ قاتل نہیں ہوں میں

اس زمین میں حضرت شاکی نے اپنی غزل پڑھی اور بقول شخصے مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔

دعوائے قتل سے مرے گھبرا کے حشر میں

قاتل پکارتا ہے کہ قاتل نہیں ہوں میں

محفل میں جان ڈال دی شاکی نے آتے ہی

کہنے پہ اور کہتے ہیں قابل نہیں ہوں میں

اس مشاعرے میں سیدنا ظرا حسین، عنایت اللہ انصاری عنایت، مصطفیٰ بابو خلش، عبدالرزاق شہر اور محمد حنیف اشہر آروی وغیرہ نے بھی اپنی غزلیں پڑھی تھیں۔ ۱۹۴۱ء کے بعد ماسٹر قاسم بابو کی تحریک پر مشاعرے تھ تلہ (ریل پارک علاقہ) میں منعقد ہونے لگے۔ ہر مشاعرے میں شاکی صاحب کی شرکت لازمی تھی۔

پھر آزادی اپنے جلو میں آگ و خون کا سیلاب لیے نمودار ہوئی۔ کتنے لوگ مارے گئے، کتنی مانگیں سونی ہوئیں، کتنے بچے یتیم ہو گئے، اس کا حساب تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اس افراتفری کے عالم میں بہت سے ادیب و شاعر پاکستان ہجرت کر گئے۔ کانکی نارہ کی بھری پری بستی اجڑ گئی۔ انجمنیں ویران، آشیانے برباد، ہر طرف عجب ہوکا عالم تھا۔ یہ سلسلہ کچھ برسوں تک برقرار رہا۔ اس کے بعد جب محفلیں از سر نو آراستہ ہوئیں تو حضرت شاکی کی شاعری پر جمود طاری ہو چکا تھا۔ حالات نے انھیں اتنا دل برداشتہ کر دیا تھا کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ یہ وحید عرشی (مرحوم) کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۷۷ء کے آل انڈیا مشاعرے میں وہ دوبارہ منظر عام پر آئے اور اور مشاعرے کی صدارت فرمائی۔ اہالیان کانکی نارہ نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ اس مشاعرے کی نظامت حضرت حامی گورکھپوری کے سپرد تھی۔ کلکتے سے حبیب ہاشمی، دانش کلکتوی، شہود عالم آفاقی کے علاوہ جمشید پور سے جوگا سنگھ انورا و شبنم برن پوری وغیرہ نے محفل کی زینت بڑھائی تھی اور مشاعرہ بہت ہی کامیابی کے ساتھ صبح تک چلتا رہا تھا۔ شاکی صاحب نے میر کی زمین میں جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع یوں ہے۔

نطق بیتاب نے منہ چوم لیا آخر شب
 دیرپا ہو نہ سکا رنگِ حنا آخر شب
 یہی وہ زمانہ تھا جب شاکی صاحب نے جم کر شاعری کی۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔
 مجبوری فطرت کیا کہیے، یہ اپنی اپنی قسمت ہے
 جب پھوٹ کے روئی شبنم تو کلیوں کا تبسم جاگ پڑا
 گو طبع رواں میں جولانی باقی نہ رہی شاکی لیکن
 جب شعر و سخن کی بات آئی ارمانِ تکلم جاگ پڑا
 محبت زندگی کی سب سے مشکل آزمائش ہے
 مگر یہ آزما لینے کے قابل آزمائش ہے
 بن بن کے جب بھی بگڑی ہے تقدیر کی روش
 اپنی ہی کوششوں سے سنوارا ہے دوستو
 اک عمر کڑی دھوپ میں فرقت کی کٹی ہے
 زلفوں کی گھٹا آج ذرا جھوم کے برسے
 صد چاک جگر میں بھی لیے جاتا ہوں شاکی
 سنتا ہوں رفو کرتے ہیں وہ تارِ نظر سے
 میخانے میں خم کے خم ہر روز لٹکھائے جاتے ہیں
 لیکن ہم اک بوند کی خاطر آج بھی ترسے آگے بھی

حضرت شاکی کے شاگردوں میں ڈاکٹر سراج عرشی، وحید عرشی، دل عرفانی اور انور بارود وغیرہ کا نام آتا ہے۔ ڈاکٹر سراج عرشی مضافات کے مشاعروں میں دلچسپی کے ساتھ سنے جاتے تھے۔ وحید عرشی نے شعر و شاعری کے میدان میں کافی شہرت پائی۔ شاکی صاحب کے عزیز شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کا انتقال ۳ فروری ۱۹۸۶ء کو ہوا۔ ”یادوں کا زنداں“ کے نام سے وحید عرشی پر ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے جس کے مرتب کمال جعفری ہیں۔ مرحوم وحید عرشی کلکتہ اور مضافات دونوں جگہ یکساں مقبول تھے۔ دل عرفانی کا تعلق بالواسطہ رہا۔ انور بارود کو ہزل گوئی کے میدان میں شہرت ملی۔ تقریباً ۸۳ برس کی عمر میں ۶ اگست ۱۹۹۳ء کو شاکی صاحب کا انتقال ہوا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی باتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

نوٹ: ۱۔ یہاں ناظر سے مراد سیدنا ظرا الحسینی اور شاکر سے مراد شاکر کلکتوی ہے۔

۲۔ اس انجمن کا نام ”بزمِ ادب“ اس سلسلے میں مصطفیٰ بابو خلس کا ایک شعر کافی مقبول ہوا تھا۔

تو نے کیا ڈالی بنا بزمِ ادب کی اے خلس
 کا گنارے کا ہر اک بچہ غزل خواں ہو گیا

وحید عرشی: بحیثیت نثر نگار

”زندگی کی کہانی بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ آنکھیں بند ہوتے ہی آدمی افسانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کا یہ مختصر سا سفر اتنا طویل کیوں محسوس ہوتا ہے۔ اتنا دشوار کیوں ہوتا ہے۔ اس نے بھی شاید یہی سوچا ہوگا اور پھر ایک برگد کو گواہ بنا کر بغیر کھائے پئے چودہ دنوں تک سوچتا رہا اور اتنا ہی بتا سکا کہ موت کس طرح آسان ہو سکتی ہے۔“

اپنی موت سے گیارہ سال قبل وحید عرشی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کی زندگی کے سفر کا سلسلہ مختصر ہی نہیں بلکہ منقطع ہو جائے گا اور وہ بھی ایک حقیقت سے افسانہ بن کر رہ جائیں گے۔ سدھارت نے تو عرفان حیات کے لیے چودہ سال تک ایک برگد کو اپنا گواہ بنائے رکھا اور علم حاصل بھی کیا لیکن وحید صاحب نے ہم سب کو اپنے حالات سے لاعلم رکھا اور زندگی سے عرفانِ فنا تک کا سفر چودہ دنوں کی مختصر ترین مدت میں پورا کر لیا۔ سدھارت نے تو ایک برگد کو اپنا گواہ بنا لیا تھا۔ وحید عرشی اگر کسی کو اپنے دکھوں کا گواہ بنا لیتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی زندگی آسان ہو جاتی۔ وحید عرشی کو دنیا ایک شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ”یادوں کا زندان“ کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے جس کے مرتب کمال جعفری ہیں۔ وحید عرشی کا پورا نام خواجہ وحید الحق تھا لیکن ادبی حلقوں میں وحید عرشی کے نام سے مشہور ہوئے۔ پیدائش نرائن پور (کانکی نارہ، چوبیس پرگنہ) کی تھی۔ سن پیدائش ۲۷ دسمبر ۱۹۴۳ء تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابھی وہ درجہ دہم میں پڑھ ہی رہے تھے کہ ۱۹۵۸ء میں قومی لائبریری (کانکی نارہ) جو اس وقت چوبیس پرگنہ کی سب سے بڑی لائبریری مانی جاتی تھی، نے اردو ہائی اسکولوں کے طلبہ کے درمیان ایک مباحثہ (Debate) کا اعلان کیا۔ لائبریری کے صحن میں بحث و مباحثہ کا پروگرام رکھا۔ کئی اسکولوں کے طلبہ اس پروگرام میں شامل ہوئے۔ اس ڈبیٹ کمیٹی کے ججوں میں مسعود انصاری، محسنی صاحب اور محمد ایوب انصاری شامل تھے۔ موضوع بحث کا عنوان وہیں پر چنا گیا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ جب نتیجے کا اعلان آیا تو خواجہ وحید الحق (جو اس وقت تک وحید عرشی نہیں تھے) اول انعام کا حقدار ثابت ہوئے۔ دوسرے اور تیسرے نمبر پر بالترتیب محمد اسرار نیل اور محمد اسحاق خان آئے۔ یہ دونوں چشمہ رحمت ہائی اسکول میں کلاس-VIII کے طالب علم تھے۔ اس مقابلے کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ وحید عرشی اس وقت دسویں جماعت کے طالب علم تھے اور موضوع بحث فی البدیہہ تھا اس کے باوجود انھوں نے اولیت کا اعزاز حاصل کیا۔ یہی ان کی ذہانت کی دلیل ہے اور یہیں سے ان کا رجحان ادب کی طرف مائل ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوئے ۱۹۶۲ء میں آئی اے اور ۱۹۶۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کے امتحان میں فرسٹ کلاس پوزیشن حاصل کر کے گولڈ میڈل کے حقدار بنے۔ ۱۹۶۶ء میں حمایت الغرباء ہائی اسکول کانکی نارہ سے منسلک ہوئے اور تقریباً اٹھارہ سال تک تشنگانِ علم کو سیراب کرتے رہے۔ ۱۹۷۵ء میں وہ بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی سے وابستہ ہو گئے۔ وحید صاحب کلکتہ اور مضافات کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اپنے تاریخی مجلہ

”آکاش پتر“ کے ذریعہ انھوں نے کانکی نارہ اور بھاٹ پاڑہ کی پرانی تاریخ اور اس زمانے کی ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں سے روشناس کرایا جو یقیناً ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ وحید صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ صرف ایک شاعر یا نثر نگار ہی نہیں تھے بلکہ کئی اور خوبیوں کے مالک بھی تھے۔ پتھر یا لکڑی کے ٹکڑوں پر غالب، ٹیگور یا دیگر کی شبیہ اتار دینا جہاں ان کے ذوقِ مصوری کی شہادت دیتا ہے وہیں موسیقی سے انھیں خاصہ شغف تھا۔ ایک طرف وہ کامرس کے طلبہ کی خاطر کمرشیل الفاظ کی ڈائریکٹری تیار کر رہے تھے تو دوسری جانب ”ترجمہ اور اس کا فن“ نامی کتاب کی تصنیف کر رہے تھے۔ کچھ مالی پریشانیوں کے سبب یہ کتابیں منظرِ عام پر نہ آسکیں۔ فکرِ معاش کی صلیب پر لٹکا ہوا شاعر یا ادیب منزلِ اشاعت کی پریشانیوں کو کیسے جھیل سکتا ہے۔ سچ پوچھیے تو وہ ہمارے عہد کے ایک جینیئس Genius تھے۔ ان کا مقام حمایتِ الغرباء ہائر سکولڈری اسکول تھا نہ بھوانی پورا بچو کیشنل سوسائٹی کالج بلکہ اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر ادب کی نئی بلندیوں کو چھونا تھا۔ افسوس گردشِ روزگار نے انھیں مہلت نہیں دی۔ وحید عرشی کی شخصیت کا ہر پہلو متقاضی ہے کہ اس پر بھرپور روشنی ڈالی جائے۔ اس مضمون میں یہ بتانا مقصود ہے کہ وحید عرشی نہ صرف ایک مترنم شاعر تھے بلکہ ایک اچھے ادیب بھی تھے۔ نثر نگاری کی صلاحیت ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی۔ عمر نے وفانہ کی ورنہ مغربی بنگال کے نثری ادب کے دامن میں کچھ موتیوں کا اضافہ ہو سکتا تھا۔ آج جب ہم وحید عرشی کی دسویں برسی منا رہے ہیں تو ان کی یاد بے طرح آرہی ہے۔ انھیں کے نوشتہ جملے آنکھوں کے سامنے جھلما رہے ہیں۔

”وقت ہر زخم پر پھاہار کھ دیتا ہے۔ لیکن ہر زخم داغ بھی چھوڑ جاتا ہے جس سے کچھ یادیں ہمیشہ کے لیے الجھ کر رہ جاتی ہیں۔“

وحید عرشی کو جدا ہوئے دس برس ہونے کو آئے۔ وقت نے جو سب سے بڑا امر ہم ہے، عرشی کے پس ماندگان کے زخموں پر پھاہار کھ دیا ہے لیکن اس داغ کو کیا کیا جائے، اس بے کلی کو کیسے سکون ملے جو وقت نے عطا کی ہے۔ ان سے متعلق یادیں تو ہمیشہ کے لیے الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ ان الجھی ہوئی یادوں کی ڈور سلجھاتے ہوئے ایک سراہا تھ لگتا ہے۔

”سچائی ہمیشہ نیچے دبی رہتی ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی تکلیف کر کے ہزاروں من لوہے کے نیچے دبی ہوئی سچائی کو نکالیں تو ہر جگہ کتے ہی کی لاش نکلے گی، آدمی کی نہیں۔“

اس ”لاش“ نامی افسانے میں ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وحید صاحب نے کمال چابک دستی سے فساد کے پس منظر میں تناؤ والی کیفیت کو ابھارا ہے۔ افسانے میں ایک کتے کی لاش کا تذکرہ ہے جو اوپر نیچے رکھی ہوئی ریل کی پٹریوں کے بیچ مکرر سڑ گیا ہے۔ اس سے ماحول میں کافی سرائند ہے۔ تعفن کے سبب لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ ہندو مسلمان سب موجود ہیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر فریق کا خیال ہے کہ اس کے ہی فرقہ کے آدمی کو مار کر یہاں پھینک دیا گیا ہے۔ زوردار آوازوں میں تبصرہ چل رہا ہے کہ پولیس کی گاڑی آتی ہے۔ پٹریوں کو ہٹائے جانے پر کتے کی لاش نکلتی ہے۔ انواہوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دبی ہوئی سچائی نکل کر باہر آ جاتی ہے۔ اس پس منظر کو ابھارنے اور افسانے کو کلائمیکس تک پہنچانے میں وحید صاحب نے کمال کر دیا ہے۔ وحید عرشی کا افسانہ ”لاش“ ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ اس افسانے کے ذریعہ انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف شعر و سخن پر ان کی گرفت مضبوط تھی بلکہ ایک اچھا افسانہ نگار بھی ان کے اندر موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی غزلوں پر داد و تحسین کے اتنے ڈونگرے برسائے گئے کہ اس کا نشہ آخردم تک نہیں اترتا۔ خود وحید صاحب کا یہ خیال تھا کہ مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزل کے ایک ایک

شعر پر ملنے والی داد و بوتل شراب کا نشہ رکھتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاعری کے نشہ سے وہ آخر دم تک پیچھا نہیں چھڑا سکے جس کا ثبوت یہ ہے کہ مرتے مرتے بھی غزل کا آخری مطلع کہتے گئے۔

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے
دور تک جستجو کے سائے گئے

وحید عرشی کی نثر نگاری کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:-

”اور وہ بڑھیا بھی پرسکون ہو گئی تھی جو غم سے نڈھال اپنے اکلوتے مردہ بچے کے جسدِ خاکی کو لے کر اس سے اس کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی تھی اور اس نے دوبارہ زندہ کرنے کی یہ شرط رکھی تھی کہ کسی ایسے گھر سے ایک مٹھی خاک لائے جس کے یہاں کوئی موت سے ہم کنار نہ ہوا ہو اور اسے ایک مشیتِ خاک نہ مل سکی۔“

”ان کا سراپا ہی مجھے اس لوک گیت کی طرح لگا تھا جس میں صدیوں پڑنے والے سوکھے کا ذکر ہوا اور آج بھی اس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوب جائے۔“

”جب میں ان کے اشعار کو سنتا تو ایسا لگتا جیسے ان کے دل کے پھپھو لے پھوٹ کر اشعار کی شکل میں جم گئے ہوں اور جس میں پائمال زندگی کی سسک بھی گھٹ کر رہ گئی ہو۔“

”واقعی بنگال کی سرزمین بڑی پُرکشش ہے۔ الف لیلہ ہزار داستان کے مصنف کے ذہن میں بنگال کا حسن اور جادو چنگیاں لے رہا تھا۔ تقریباً نوں صدی ہجری میں تلنگانہ میں بیٹھے ہوئے ملا وجہی نے اپنی معرکہ آراء مثنوی ”قطب مشتری“ کے لیے بنگال کی حسین و جمیل دوشیزہ کا انتخاب کیا۔ غالب بنگال سے لوٹنے کے بعد ساری عمر ہائے کرتے رہے۔ مومن کے دامنِ دل کو بھی بت بنگالہ نے کھینچا اور ان لوگوں کے لیے یہ سرزمین ایک کسک بن گئی جو اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔“

کیا مذکورہ بالا اقتباسات نثری نمونے کے طور پر پیش نہیں کیے جاسکتے۔ کیا ان کی روشنی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وحید عرشی کی زندگی نے وفانہ کی ورنہ نثر کے اور بھی نمونے دستیاب ہوتے اور مغربی بنگال کے نثری ادب کے دامن میں کچھ اور موتیوں کا اضافہ ہوتا۔

وحید عرشی کی بے وقت موت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب کا وہ چراغ گل ہو گیا جس کی روشنی سے کانکی نارہ و جگندل کی ادبی محفلیں جگمگاتی تھیں۔ وہ بنگال کی نئی نسل کے ممتاز شاعر بھی تھے اور منفرد ادیب بھی۔ ان کے پڑھنے اور لکھنے کا انداز نرا لگا تھا۔ کاش گردشِ روزگار نے کچھ اور مہلت دی ہوتی تو ہمارے اردو ادب کے دامن میں کچھ اور بیش قیمت موتیوں کا اضافہ ممکن تھا اور اس طرح اردو ادب کا دامن اور مالا مال ہو سکتا تھا۔

خلش امتیازی: کچھ یادیں کچھ آنسو

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۸۰ء کے قریب ایک مقامی مشاعرے میں خلش امتیازی سے ملاقات ہوئی تھی۔ چوبیس پچیس سال کا ایک خوش شکل، خوش مزاج نوجوان اس مشاعرے کی نقابت کر رہا تھا۔ وہ بھی اس ڈھنگ سے کہ محسوس ہوتا تھا وہ کوئی پیشہ ور، مشاق اناؤنسر ہے۔ جب ترنم سے اس نے اپنی غزل پڑھی تو سامعین کے ساتھ ساتھ میں خود اس کی آواز کے سحر میں ڈوبتا چلا گیا۔ بعد میں کچھ ساتھیوں کی زبانی پتہ چلا کہ خلش، کلکتہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل پوسٹ گریجویٹ ہے۔ حمایت الغرباء ہائی اسکول (کانکی نارہ) میں پارٹ ٹائم اردو ٹیچر کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق اسے ورثے میں ملا ہے۔ بعد ازاں کئی ادبی نشستوں/مشاعروں میں ملاقات ہوئی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور خلش کی ذات کی پرتیں کھلتی گئیں۔

خلش امتیازی نے بہت نفیس طبیعت پائی تھی۔ طبیعت میں ملنساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے والد امتیاز علی چیچل اپنے وقت کے ایک اچھے، کہنہ مشق استاد شاعر تھے۔ انھیں سیما اکبر آبادی اور جگر مراد آبادی جیسے اساتذہ فن سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ یہی ذوق شاعری خلش کو وراثت میں ملا۔ والدہ لکھنؤ کی تھیں جو اردو تہذیب کا گہوارہ بلکہ مرکز رہ چکا ہے۔ والدہ کی تربیت اور لکھنوی تہذیب دونوں کا اثر خلش پر نمایاں تھا۔

خلش امتیازی کا اصل نام خورشید عالم تھا۔ پیدائش باقر محلہ، کیلا بگان، جگتدل، چوبیس پرگنہ میں ہوئی۔ سنہ پیدائش ۳ جولائی ۱۹۵۵ء تھا۔ خلش نے کل ۴۳ سال کی عمر پائی۔ یہ عمر مرنے کی نہیں ہوتی بلکہ نکھرنے کی ہوتی ہے اور ابھرنے کی ہوتی ہے۔ خلش کی شاعری اور شخصیت کو ابھی نکھرنا تھا۔ موجوں میں ڈوب کر ابھرتا تھا۔ ادب کی نئی بلندیوں کو چھونا تھا۔ اشعار کی خوشبو کو چار داغ عالم میں بکھرنا تھا۔ وائے قسمت! موت کے بے رحم ہاتھوں نے خلش امتیازی کو ناوقت ہم سے چھین لیا۔

نفس کے دوش پہ پروازِ زندگی ٹھہری
قدم قدم پہ میں بن بن کے حادثہ بکھرا

خلش نے پہلی غزل صرف ۱۳ سال کی عمر میں ۱۹۶۸ء میں کہی تھی لیکن باضابطہ شاعری کا آغاز ۱۹۷۲ء سے ہوا۔ ابتدا میں اپنے والد امتیاز حسین چیچل سے غزلوں پر اصلاح لی۔

بعد میں حضرت ارمان شام نگری کی شاگردی اختیار کی اور خود کو اہل جنوں کی صف میں شمار کرنے لگا۔

یہ اور بات ہے اہلِ خرد نہ پہنچائیں
نگاہِ اہلِ جنوں میں تو برگزیدہ ہوں
آنسو خریدتا ہے، تبسم فروش ہے

وہ شخص آدمی ہے مگر کس قبیل کا
شاعر حساس ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ زمانے کی تبدیلیاں براہ راست اس کے دل پر اثر کرتی ہیں۔ ستاروں کی چمک
سے بھی دل پر چوٹ پڑتی ہے۔ کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے کہ دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے۔

شوق اظہار تک نہیں پہنچا
دل یہ دل دار تک نہیں پہنچا
بک گیا کوئی گھر کے آنگن میں
سودا بازار تک نہیں پہنچا

آج کا دور عجیب دور ہے۔ ایک افراتفری کا عالم ہے۔ چاروں طرف لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے۔ ہر آدمی اپنے
مسائل میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اس کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو سکے۔ اس کے لیے
تھوڑا وقت نکال سکے، اس کی غم گساری کر سکے۔

دل کا احوال سنے ، نالہ دیوانہ سنے
کس کو فرصت ہے کہ اس دور میں افسانہ سنے

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خلش کی نظامت کی دھوم مچ گئی۔ ترنم کے جادو نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ دور دراز مقامات
سے دعوتیں آنے لگیں۔ اب وہ ایک مشہور و معروف شاعر بن چکا تھا۔ اس کی شہرت بنگال کی سرحدوں سے نکل کر یوپی، بہار، آندھرا
پردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، دہلی وغیرہ تک پہنچ چکی تھی۔ وہ ملک میں گھوم گھوم کر اپنے ترنم کا جادو جگا رہا تھا۔ لوگوں کو دیوانہ بنا
رہا تھا۔ کلکتہ کے حبیب ہاشمی اور جمشید پور کے جوگا سنگھ انور اپنے ترنم کے لیے پہلے ہی سے مشہور تھے۔ اب خلش کا ترنم سامنے آیا تو
ادبی حلقوں میں یہ تینوں ”ج ج خ“ کے نام سے ایک ادبی مثلث بن چکے تھے۔ یہی دور خلش کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ اس
نے جم کر شاعری کی۔ اس وقت ذہن کی سطح پر کچھ اشعار ابھر کر آواز دے رہے ہیں۔

یہ دورِ معرکہ ہے ہجرتوں کی مت پوچھو
یہ طرزِ فکر تسمیں روسیہ کردے گا
یہ روزِ روز کے جھگڑے مثالو اک دن میں
یہیں پہ وقت تسمیں شیرشاہ کردے گا
موج ہاتھوں سے نہ نکلے نہ کنارہ جائے
آؤ طوفان کو کشتی میں اتارا جائے
خوبصورت جوان لگتی ہے یہ صدی بے ایمان لگتی ہے
ماں کسی کی اگر ہو سوتیلی مجھ کو ہندوستان لگتی ہے
اک سال زندگی کا مری یوں گزر گیا
گویا کہ کوئی بوجھ تھا سر سے اتر گیا

ہمارے ملک میں جمہوریت مری تو نہیں یہ کس کی موت پہ پھر سرنگوں ترنگا ہے

دلوں میں میل ہے اس کا کوئی خیال نہیں سبھوں کو فکر ہے میلی ہماری لنگا ہے
خلش امتیازی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ بہت سارے رسالے اس کے پاس آتے تھے۔ ہر رسالے کو شروع سے
آخر تک پڑھنا اس کی فطرت تھا۔ وسیع مطالعہ نے اس کے اندر شعر و ادب کی بے پناہ صلاحیت بھر دی تھی۔ حافظہ بھی غضب کا
پایا تھا۔ بذلہ سنجی طبیعت میں داخل تھی۔ معمولی جملوں سے محفلوں کو زعفران زار کر دیتا تھا۔ دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اکثر
شام کو دوست احباب اس کی رہائش گاہ پر جمع ہوتے، محفلیں جمتیں، خاطر داریاں ہوتیں۔ ان دوستوں کی محفل میں ہنسنا، ہنسانا
اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ آفات و مصائب اپنا گھیرا ڈالے رہتے اور وہ انھیں مسکرا کر الوداع کہتا رہتا۔

ہم پہ جو حادثات کا سورج گرا تو کیا
ہم بھی تو ساعتوں کی طرح مسکرائے ہیں
ساعتوں کی طرح مسکرانے والا شعرا اپنے آخر وقت میں کسی کمپلکس کا شکار ہو چکا تھا جی تو ایک موقع پر اپنے آپ سے سوال
کرتا ہے۔

مجھ کو خاموش خلش کرتے ہیں گونگے بہرے
کیا مرے پاس نقابت کے سوا کچھ بھی نہیں
خلش کے پاس نقابت کے سوا بھی بہت کچھ تھا۔ ذہانت تھی، بذلہ سنجی تھی، حاضر جوابی تھی۔ اپنے طور پر زندگی کرنے
کا ڈھنگ تھا۔ یاروں سے یاری تھی، رشتوں میں استواری تھی، انا کی پاس داری تھی۔ اس کے پاس خلوص تھا، محبت تھی، شرافت
تھی، خاکساری تھی۔ اتنی ساری خوبیوں کا مالک شاعر بھلا یا نہیں جاسکتا۔

افسانہ نگاری کے میدان میں بھی خلش نے اپنے جوہر دکھلائے۔ پچاسوں افسانے لکھے۔ اس کا پہلا افسانہ ”لمحوں
کے آنسو“ تھا۔ ”تجربہ“ نامی افسانہ ۱۹۷۵ء میں بیسویں صدی (دہلی) کے صفحات کی زینت بنا۔ انشاء کلنتہ کے ”عالمی افسانہ نمبر“
میں بنگال سے جن دو افسانہ نگاروں کو جگہ ملی، ان میں ایک نام خلش امتیازی کا بھی تھا۔ اس کا افسانہ ”لباس“ عالمی افسانہ نمبر کی
کسوٹی پر پورا اتر اور شمارے کی زینت بنا۔ یقیناً یہ اعزاز کی بات تھی جب کہ نامور افسانہ نگار اس شمارے میں جگہ نہیں پاسکے۔

دیگر افسانوں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔ آدھا آدمی، دستخط، گم شدہ آواز۔ ان افسانوں میں ”گمشدہ آواز“ مجھے
بیحد پسند آیا۔ افسانے کا ہیرو رشید خلش کے اصل نام خورشید سے مطابقت رکھتا تھا۔ افسانہ کیا تھا، خلش کی اپنی زندگی کی کچھ
جھلکیاں تھیں جو نوکِ قلم سے پھسل کر کاغذ کے صفحات پر مرثم ہو گئی تھیں۔

خلش امتیازی نے طنز و مزاح کے پھول بھی کھلائے۔ چار پانچ مزاحیہ مضامین بھی لکھے جس میں ”ٹی وی اور بیوی“
کافی مقبول ہوئی۔

حاجی نگر سے شائع ہونے والا پرچہ ”لمعات“ (ایڈیٹر: ناصر علی انصاری) میں خلش امتیازی کی شاہکار تخلیقات زیر
طباعت کے عنوان سے ایک اعلان نظروں سے گزرا۔

۱ من علق (افسانوں کا مجموعہ)

۲ استفادہ (شعری مجموعہ)

۳ رومی رشید (ناول)

افسوس! زندگی نے وفانہ کی اور ہم سب خلش کے اتنے سارے افسانوں، غزلوں اور ناول سے محروم رہ گئے۔
المیہ یہ ہے کہ زندگی میں ہمیشہ ہنسے ہنسانے والا شاعر، معمولی لمحوں/ باتوں کو انجوائے کرنے والا ادیب اپنے
آخری لمحوں میں مایوسیوں کا شکار ہو چکا تھا۔ اندر ہی اندر وہ ٹوٹ رہا تھا، بکھر رہا تھا۔ آخر کار ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کی صبح
اس کی زندگی کا وہ آئینہ ٹوٹ گیا جس میں ہم سب کو اس کی حسین شکل نظر آتی تھی۔
میری تو صرف اتنی سوانح حیات تھی
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا اور بکھر گیا

صابر وارثی: یادوں کے جھروکے سے

غالباً ۱۹۷۲ء کا زمانہ تھا۔ ضلع ہگلی کے چند نگر نامی مقام پر اردی بازار کے اردو متوالوں نے ایک آل انڈیا مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ ان دنوں راقم الحروف کو مشاعروں سے ہیجڈ لچپی تھی۔ لہذا اپنے عزیز دوست محمد اسرائیل کے ساتھ چند نگر جا پہنچا۔ مشاعرہ تقریباً رات گیارہ بجے شروع ہوا۔ ہندوستان کے مشہور و معروف شعراء کرام اس محفل میں رونق افروز تھے۔ رات ڈیڑھ بجے جمشید پور سے آئے ہوئے مشہور شاعر جوگا سنگھ انور نے ترنم کا جادو جگایا۔ بعد ازاں مضافات کے ایک معمر شاعر کا نام پکارا گیا۔ بیشتر لوگوں کی زبان پر تھا کہ جوگا سنگھ انور کی غزل سرائی کے بعد یہ شاعر قتل ہو جائے گا جو اپنے روایتی لباس پاجامہ، کرتا اور کالی شیروانی میں ملبوس وقار و تمکنت کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ سامعین کے اصرار پر ”اللہ قسم“ والی ردیف پر مشتمل غزل سے آغاز کرتا ہے۔ ترنم اس قدر شاندار کہ لوگ عیش عیش کراٹھتے ہیں۔ داد و تحسین سے پنڈال گونج اٹھتا ہے۔ ”ایک اور“ ”ایک اور“ کی فرمائش ہونے لگتی ہے۔ یہ تھے صابر وارثی اور ایسا تھا ان کے پڑھنے کا انداز۔ کچھ اشعار جو اس وقت ذہن کی وادیوں سے پھسل کر زبان پر آرہے ہیں، اس طرح ہیں۔

خشک آنکھوں میں کبھی مد و جزر آیا تھا
طعنہ زن آج بھی ہیں گنگ و جمن اللہ قسم
شیخ صاحب کا ہے اصرار نہ توبہ ٹوٹے
اور یہ کالی گھٹا توبہ شکن اللہ قسم

صابر وارثی کا اصل نام محمد یوسف تھا۔ بڑے لڑکے محمد صابر کی والہانہ چاہت میں اپنا تخلص صابر رکھ لیا تھا۔ گیا کے رہنے والے تھے۔ پاؤں میں چکر تھا لہذا ایک جگہ جم کر کام نہیں کیا۔ گیا، آسنسول، بنڈیل، ٹیابر ج اور جانے کہاں کہاں کا چکر لگا کر کانکی نارہ وارد ہوئے تھے۔ واجد علی شاہ کی نگری ٹیابر ج میں ہی عروسِ سخن کی زلفوں کے اسیر ہوئے اور آخر دم تک اس اسیری پر فخر کرتے رہے۔

۱۹۶۲ء میں کلکتہ بھیا نک فساد کی لپیٹ میں آ گیا۔ اوپر سے ڈی آئی آر (DIR) کی مار لگ پڑی۔ اچھے اچھوں کے پیر اکھڑ گئے۔ حالات نے صابر صاحب کو بھی بوریا بستر باندھ لینے پر مجبور کر دیا۔ اگلا مستقر کانکی نارہ قرار پایا۔ مضافات کے مشاعروں میں کافی شہرت پائی۔ گروپ بندی سے کوسوں دور تھے لیکن سخن سنجی میں سوز سکندر پوری سے کافی نزدیک تھے۔ صابر صاحب کیف و مستی کے شاعر تھے۔ حسن و عشق ان کی شاعری کا جزو لاینفک تھا۔ سچ پوچھیے تو ان کا مزاج عاشقانہ تھا۔ ان کا دل عشق کی لذتوں سے سرشار تھا جس کا اظہار ان کی نظم ”لمحوں کی کسک“ سے بھی ہوتا ہے اور دیگر غزلیہ اشعار سے بھی۔

ابھرا ہے نہ ابھرے گا کبھی ڈوبنے والا

ہم معجزہ چاہ ذقن دیکھ رہے ہیں
 صابر ذرا وہ تیشہ فرہاد اٹھا لا
 پتھر کے لبادے میں بدن دیکھ رہے ہیں
 ہم نہ شکوہ نہ شکایت نہ گلہ کرتے ہیں
 مذہب عشق میں جو کچھ ہے روا کرتے ہیں
 سبائیں شیخ حرم میں تراش کر پتھر
 شبیر یار بناؤں تو آزری ٹھہرے
 ابرو پہ بل ہے کس کی قضا آگئی حضور
 شمشیر آبدار برہنہ ابھی سے ہے

صابر صاحب اپنی زندگی میں جتنے خوش مزاج تھے اتنے ہی پروقار بھی تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ تعلیم یافتہ افراد بھی، جوٹ ملوں میں کام کرنے والے مزدور بھی۔ امیر و غریب بھی۔ ہندو مسلم کی کوئی قید نہیں تھی۔ انھوں نے زمانے کی نیونگیوں کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا تھا۔ ہاتھ ہمیشہ وقت کی نبض پر رہا۔ جو کچھ دیکھا محسوس کیا بے کم و کاست اپنے شعروں میں بیان کر دیا۔ اس معاملے میں وہ کسی مصلحت کے شکار نہیں ہوئے۔ اس وقت نوکِ زباں پر جو اشعار آرہے ہیں کچھ اس طرح سے ہیں۔

میں حق بھی بولوں تو دار و رسن میسر ہو
 وہ جو بھی کہہ دیں وہ اندازِ دل بری ٹھہرے
 ہم موجِ حوادث کے چلن دیکھ رہے ہیں
 آہن کی جبیں پر بھی شکن دیکھ رہے ہیں
 زاہد تنگ نظر سے ہمیں ڈر لگتا ہے
 وہ جسے چاہے سرِ دار چڑھایا جائے
 آدمی آدمی کے دامن میں کس قدر آرزو سے پلتا ہے
 آدمی آدمی کا ایندھن ہے آدمی آدمی سے جلتا ہے

شاعر حساس ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ ذرا سی چوٹ پر دل کا آگینہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ شاعری کی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے انھوں نے معاملاتِ عشق اور وارداتِ قلبی کو اپنے اشعار میں جگہ دی۔

ہوش اب تک نہیں اک جامِ پیا تھا میں نے
 پینے والے تو شب و روز پیا کرتے ہیں
 ہوگئی ہوگی مجھ سے بھی لغزش
 مدعا عرض کر دیا ہوگا

صابر صاحب بہت ہی نرم و نازک دل کے مالک تھے۔ ذرا سی بات پر متاثر ہو جایا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں زمانے کی کروٹ سے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی۔ عمر کی چھٹی دہائی میں زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ دینے والی ہم سفر نے

داغِ مفارقت دے دیا۔ یہ صابر صاحب کا ہی دل تھا جو اس سانحہ کو جھیل گیا۔

دوچار گام چل کے بچھڑ جائے ہم سفر
صابر خد کسی کو بھی یہ حادثہ نہ دے
قطعات نگاری سے بھی انھیں خاصہ شغف تھا۔ درج ذیل قطعات میں جہاں قدرتی مناظر کی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے وہیں قلبی جذبات اور انسانی ظرف کی بات بھی کہی گئی ہے۔

راز پنہاں کہا نہیں جاتا اور چپ بھی رہا نہیں جاتا
سہہ تو لیتا ہوں صدمہ ان کا طعنہ سہا نہیں جاتا
جانکاہ

کہاں کا شیشہ کیسا جام چشمِ فسوں کا ادنیٰ کام
روئے منور، گیسوئے پرخم صبح بنارس، اودھ کی شام

تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وفات کی تاریخ ۲۳ مارچ ۱۹۸۸ء (بروز جمعرات) ہے۔
آج صابر صاحب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی باتیں، ان کے اشعار بے تحاشا یاد آ رہے ہیں۔

سات پردے میں بھی رہ کر ترا جلوہ ہے عیاں
ایسے بے پردہ کہیں پردہ نشیں ہوتے ہیں
صابر رہے گا صابر، برقِ تپاں سمجھ لے
سو بار چاہے اس کا تو آشیاں جلا دے
دشوار ہے زبکہ ولے زندگی کی راہ
پابندی حصارِ سفر مانگتے نہیں
خشتِ باری نہ کرو شیش محل سے یارو
سنگ پھینکے نہ کہیں کوئی بغل سے یارو
ظرفِ انسان کا باتوں سے پتہ چلتا ہے
راز کھلتا ہے سخنور کا غزل سے یارو

جمیل احمد الہ آبادی : کچھ یادیں

رات کو سونے سے کچھ پہلے کسی ادبی پرچے/ڈائجسٹ کا مطالعہ میری عادت میں شامل ہے چنانچہ آج صدائے احباب ۱۹۸۰ء نامی مجلہ مطالعہ کرتے ہوئے مولانا جمیل احمد الہ آبادی کی صورت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی اور تقریباً ۲۵-۳۰ برس پہلے کے واقعات تحت الشعور سے نکل کر شعور کے آئینہ خانے میں جلوہ افروز ہونے لگے اور ذہن مولانا کی یادوں میں ڈوبنا چلا گیا۔

شاید وہ جون ۱۹۶۹ء کا زمانہ تھا۔ ملت پرائمری اسکول واقع گوری پور چوبیس پرگنہ میں سائنس کے ٹیچر کے لیے ایک جگہ خالی تھی۔ ان دنوں بی ایس سی کرنے کے بعد راقم الحروف ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتا تھا چنانچہ جیسے ہی یہ خبر ملی، کانکی نارہ کی ایک اہم سماجی شخصیت خواجہ شریف الحق کی معیت میں ملت اسکول کے سکریٹری عبدالمجید انصاری سے ملا۔ سکریٹری صاحب اسکول لے گئے۔ اسکول چل رہا تھا۔ ایک مولانا جن کی عمر تقریباً ۳۵-۳۶ سال رہی ہوگی بچوں کو اردو/عربی کا درس دے رہے تھے۔ یہی مولانا جمیل احمد تھے۔ گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ فکرِ معاش نے گوری پور پہنچا دیا ہے۔ مولانا شفقت سے پیش آئے۔ ان کے علاوہ ٹیچر اور بھی تھے لیکن دل کم بخت مولانا کی جانب ہی کھینچتا رہا۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اردو، عربی اور فارسی پر کافی دسترس حاصل تھی۔ تقریباً تین چار مہینے تک اسکول میں مولانا کا ساتھ رہا۔ پھر میں ایک دوسرے اسکول سے منسلک ہو گیا۔

دوسری بار ۱۹۸۰ء میں منبہ دھسردار کی مسجد میں اچانک مولانا سے ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا کہ اسی مسجد میں وہ بچوں کو دینی تعلیم کا درس دیتے ہیں اور امامت بھی کرتے ہیں۔ راقم الحروف ان دنوں ایم اے (اردو) کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ ڈاکٹر اقبال کی نظموں اور غزلوں کو سمجھنے میں مولانا سے کافی مدد ملی۔ نمازِ عشاء کے بعد ان کے حجرے میں گھنٹوں ادبی بحث چلتی۔ کبھی کبھار مولانا اپنی غزلیں بھی سناتے تب پتہ چلا کہ مولانا ایک زود گو شاعر ہیں اور ایک ہی نشست میں دو تین غزلیں کہہ لیا کرتے ہیں۔ ان کی پُرگوئی نے کافی متاثر کیا۔

۸۵-۱۹۸۶ء میں وہ مدرسہ زینت العلوم واقع مانک پیر کانکی نارہ ۲۴ پرگنہ سے وابستہ ہو گئے۔ لگتا تھا کہ مولانا کے پیروں میں کوئی چکر تھا جو انھیں ایک جگہ جم کر کام کرنے نہیں دیتا۔ اتوار کا دن میری تعطیل کا دن ہوتا تھا۔ اس دن مولانا میرے گھر چلے آتے۔ گھنٹوں شعر و شاعری، ادب، سیاست اور حالاتِ حاضرہ پر تبادلہ خیال ہوتا۔ مولانا کے ساتھ گفتگو یا بحث و مباحثہ میں طبیعت بالکل نہیں گھبراتی تھی۔

مقامی مشاعروں میں مولانا پابندی کے ساتھ اپنی غزلوں کے علاوہ کبھی کبھی ہزل کے ساتھ بھی شریکِ مشاعرہ ہوتے۔ پہلے سنجیدہ غزل سناتے پھر مزاحیہ۔ سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ڈھنگ نہیں کھانا پکانے کا تجھے اے میری جاں
 آج کی تازہ کچی ، کل کا آلو دم لگے
 پھر ایک دن خبر ملی مولانا پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ دماغ کی کوئی رگ متاثر ہوئی ہے۔ انھیں اسپتال لے جایا گیا۔ ابھی
 میں جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پتہ چلا مولانا واپس گھر آ چکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے ضروری تشخیص کے بعد انھیں
 رخصت کر دیا ہے۔ گھر پر ملا۔ پہلے سے وہ خود کو بہتر محسوس کر رہے تھے اور بالکل نارمل دکھائی دے رہے تھے۔
 شاید وہ اکتوبر ۱۹۸۹ء کا مہینہ تھا جب خبر ملی مولانا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ بچپن سال کی عمر میں اس سرائے فانی
 سے کوچ کر گئے۔ پتہ نہیں یہ ڈاکٹروں کی غلط تشخیص کا نتیجہ تھا یا واقعی دماغ کی کوئی رگ بیکار ہو گئی تھی۔ مولانا جمیل احمد الہ آبادی
 نے جو کچھ لکھا وہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ کچھ اشعار جو میری ڈائری میں محفوظ ہیں انھیں قارئین کی دلچسپی کی خاطر
 ضبط تحریر میں لاتے ہوئے مجھے خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ شاید اسی بہانے ان سے گزشتہ رفاقتوں کا کچھ حق ادا ہو سکے۔

پھولوں کے چڑھانے کا دستور پرانا ہے
 تم خار چڑھاؤ گے یہ تو نہیں سوچا تھا۔
 جب وہ میری عیادت کو آنے لگے
 خود بخود زخمِ دل مسکرانے لگے
 بڑھا ہوں دوستو اپنا سمجھ کے اس کی طرف
 اگر کہیں وہ ہوا اجنبی تو کیا ہوگا
 رکھ دے گا جیب و داماں کے بچے ادھیڑ کر
 ٹک پٹخے جنون کو ناخن خدا نہ دے
 جب تیری بے رخی پہ ہمیں صبر آ گیا
 پھر تجھ سے التفاتِ نظر مانگتے نہیں
 تری گدائی ہے بادشاہی
 ترا یہ چوکھٹ ہے تختِ شاہی
 غلام کہہ کر مجھے پکارو
 خطاب لے کر میں کیا کروں گا
 جہاں بھی تیرا جمال دیکھا
 ہوا میں بخود جھکا دی گردن
 ازل سے ہوں حسن کا پجاری
 ثواب لے کر میں کیا کروں گا

مولانا کی ایک نعت کے کچھ اشعار راقم الحروف کو مولوی یسین صاحب (ساکن مانک پیر، کانکی نارہ-۲۴/پرگنہ) کی

وساطت سے ملے جو درج ذیل ہیں۔

یا نبی جو بھی تمہارا ہو گیا
 بالیقین رب کا دلارا ہو گیا
 جس نے دیکھی ہے مدینے کی فضا
 اس کو جنت کا نظارہ ہو گیا
 نعت کہنے کو جمیل بے نوا
 ان کی بخشش کا سہارا ہو گیا

مولانا نے بڑی باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ بذلہ سنج بھی غضب کے واقع ہوئے تھے۔ معمولی باتوں سے محفل کو
 زعفران زار بنادیا کرتے تھے۔ افسوس! آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں کو برماتی رہے گی۔

سراج عرشی : ایک البیلا شاعر

دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی کے بعد اگر کسی دبستان کا ذکر کیا جاسکتا ہے تو وہ ہے دبستان بنگالہ۔ بنگال کا عروس البلا و کلکتہ جہاں اپنی تجارتی اور انقلابی سرگرمیوں کے لیے تاریخی اہمیت کا حامل ہے، وہیں اپنی ادبی شناخت بھی رکھتا ہے۔ اس عظیم شہر کے افق پر ادبی دنیا کے بے شمار آفتاب و ماہتاب طلوع ہوئے اور ہندوستان کی فضائے بسیط کو روشن کر گئے جن سے اہل نظر کی آنکھیں خیرہ ہوتی رہیں۔ نہ صرف کلکتہ بلکہ اس کے مضافات کی زمین بھی ادبی زرخیزی کا ثبوت دیتی رہی ہے۔

ضلع ۲۴ پرگنہ میں کانکی نارہ ایک ایسا ہی دور افتادہ گوشہ ہے جہاں ہمیشہ شعرو سخن کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔ بہت سارے رنگارنگ ستارے روشن ہوئے۔ کچھ کی روشنی مضافات سے نکل کر ملک کے کونے کونے میں پہنچی اور کچھ کی روشنی مضافات تک ہی محدود رہی۔ ان میں کچھ تو امتداد زمانہ کے شکار ہوئے اور کچھ اپنے ہی حالات کے۔ ایسے ہی شاعروں میں ایک نام سراج عرشی کا تھا۔ وہ کلکتہ سے تقریباً چالیس کیلو میٹر دور مضافات کی بستی میں جو کانکی نارہ کے نام سے مشہور ہے، پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور اسی ذوق نے انھیں حضرت ابراہیم ناشاد تک پہنچا دیا۔ ناشاد کے علاوہ وہ اور بھی بہت سے اہل قلم حضرات سے فیضیاب ہوتے رہے۔ ان کی غزل پڑھنے کا ایک منفرد انداز تھا۔ تحت میں پڑھتے تھے۔ الفاظ کی ادائیگی میں کشش تو تھی ہی، حرکات و سکنات بھی کچھ اس طرح کرتے تھے کہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ عرشی کے بارے میں اہل الرائے اس بات پر متفق ہیں کہ وہ بھاری بھر کم جرائد کے شاعر نہ سہی لیکن مشاعروں کے شاعر ضرور تھے۔

ان کا تخلص عرشی تھا لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کا رشتہ عرش یا فلک سے نہیں بلکہ زمین یا فرش سے تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے افکار عرش کے درخشندہ کہکشاؤں سے منتخب نہیں کیے بلکہ پیش پا افتادہ سنگ ریزوں کو اپنے خیال کا محور بنایا۔ انھوں نے زندگی کی تخلیق کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ ان کا مرکز نگاہ مخلوق کی زندگی سے منسوب تھا۔ ان کے یہاں فکر کی بلندی تو نہیں ملتی لیکن فقر کی شان بے نیازی جا بجا ملتی ہے۔ استغناء ان کی زندگی تھی اور قناعت ان کی شاعری کی جان۔ ان کے شعروں کا ایک سرسری مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے غور و فکر کی شاعری تو نہیں کی لیکن عسرت زدہ زندگی میں آنے والے غور و فکر کے لمحات کی ترجمانی ضرور کی۔

سچ بات گر کہے گا تو عرشی یہ سوچ لے
لے دے کے تیرے حصے میں تنہائی آئے گی
کیسے کہوں میں غم کی حقیقت سانسوں پر ہے بار بہت
آج نہیں ہے کوئی اپنا کل تک تھے دل دار بہت
کس بھیڑ میں کھڑے ہو کہ تنہائی بڑھ گئی
یا سو جھتا نہیں ہے یا مینائی بڑھ گئی

سراج عرشی کی شخصیت ان کی شاعری سے زیادہ مقبول تھی۔ اردو ادب میں غالب کو حیوان ظریف کہا گیا ہے۔ کانکی

نارہ میں سراجِ عرشی کی شخصیت بھی حیوانِ ظریف سے کم نہیں تھی۔ اس موازنے سے یہ مراد نہیں کہ راقم الحروف غالب اور سراجِ عرشی کو ہم پلہ سمجھتا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ غالب کی شاعری ممکن ہے سراجِ عرشی اور مجھ جیسے راقم الحروف کے لیے ناقابلِ فہم ہو، جہاں تک ظرافت کا سوال ہے، غالب سے متعلق میں نے سنا ہے جب کہ سراجِ عرشی کو میں نے دیکھا ہے۔ وہ سراپا بذلہ سنج تھے۔ ان کا ایک معمولی سا فقرہ بھی محفلوں کو زعفران زار بنا دیتا تھا۔

کسی شاعر کا تعارف اس کا کلام کراتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اگر کوئی کسی شاعر کی شخصیت کی تصویر کشی کرنا چاہتا ہو تو اس کے دیوان میں بکھرے ہوئے الفاظ خیالات، احساسات اور بیانات کی ترتیب و تنظیم سے شاعر کا پیکر تراش سکتا ہے لہذا یہ کام میں قاری پر چھوڑنا ہوں اور تعارف کے طور پر سراجِ عرشی کے منتخب اشعار رقم کر رہا ہوں۔

اک کاروانِ گردِ سفر کو بہ کو تو ہے
ہر سو تری تلاش ، تری جستجو تو ہے
مت کھیپے یہ کھیلِ محبت کی راہ میں
ہو آبرو کسی کی مگر آبرو تو ہے
دنیاۓ محبت میں یہ حال ہوا عرشی
ہم خود ہی تماشا ہیں اور خود ہی تماشاۓ
ہم نے زبان کھولی تو ہم خار بن گئے
چپ سادھ کے وہ صاحبِ کردار بن گئے
راز رہے گا کب تک راز
پتھر میں بھی ہے آواز
دیکھ کے دنیا ہے حیران
میرے تخیل کی پرواز
جلا کر خاک کر ڈالو مگر اتنا سمجھ لینا
کہ میرے بعد ہی تیرے کفن کی آزمائش ہے
سب کی بگڑی مقدر بناتے ہو تم
کچھ تو میرے لیے بھی جتن دیتا
آج کہنا پڑے گا تمہیں بے جھک
ہم کو کس نے کیا بے وطن دیتا
بات تو کچھ نہ کچھ یقیناً ہے
آنکھ یوں ہی تو بھر نہیں آتی
خفا خفا سے تری نگہِ التفات لگی
بجھی بجھی سی ہمیں ساری کائنات لگی

جن کے ہونٹوں پہ تبسم کی لکیریں کل تھیں
 اپنی آنکھوں میں وہ برسات لیے پھرتے ہیں
 لحنِ داؤدی کا مالک نہ سخنور ہے وہ
 کیوں جنابِ عرشی کو حضرات لیے پھرتے ہیں

۱۹۸۷ء یکم فروری کو سراجِ عرشی نے اس جہانِ رنگ و بو سے اپنا نانا توڑ لیا۔ ابھی ان کے مرنے کے دن نہیں تھے۔
 کانکی نارہ کی ادبی محفلیں سو گوار ہو گئیں۔ آج بھی جب کبھی محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی ہے تو ہماری آنکھیں مرحومِ عرشی کو ڈھونڈنے
 لگتی ہیں۔

بزمِ مشاعرہ سے آواز آرہی ہے
 اپنا کلامِ عرشی اک بار پھر سنا دے

بشیر الدین ظامی : ایک تاثر

۶۲-۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ محرم الحرام کا مہینہ تھا۔ کانکی نارہ میں اس وقت مستقیم خلیفہ کے اکھاڑے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ قرب و جوار کے علاقے جیسے مانک پیر، کیلا بگان، رستم گئی جکتدل سے بھی اکھاڑے نکلتے تھے لیکن گلی نمبر ۳۳ کانکی نارہ کے اکھاڑے میں جو بات تھی۔ ۷

وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

محرم کی نویں تاریخ کو پولیس کی نگرانی میں یہ اکھاڑا بڑی شان سے نکالا جاتا۔ اکھاڑے کا نمبر ایک تھا۔ اسی سبب سے سب سے پہلے مذکورہ اکھاڑا پیپر مل گیٹ (کانکی نارہ) تک جاتا۔ وہاں سے کھیل تماشے کا دور شروع ہوتا۔ بانا، بنوٹ، لکڑی، گدک، بھالا، تلوار، پاٹا، بنٹھی کے کھیل تماشائیوں کو محظوظ کرتے۔ ایسے ہی ایک کھیل میں بشیر الدین صاحب کو جو اس وقت تک ظامی نہیں بنے تھے، میں نے بنوٹ کا مظاہرہ کرتے دیکھا۔ بہت مشاقی اور مستعدی سے وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دورانِ مظاہرہ ان کی چستی پھرتی، حرکات و سکنات، آنکھوں کا تاثر غضب کا تھا۔ ان کے اس کھیل سے میں کافی متاثر ہوا۔

دوسری مرتبہ، حاجی نگر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ جوائے اسٹوڈیو میں ایک تصویر کو پینٹ کر رہے تھے۔ چائے کا دور چلا۔ اس دن پتہ چلا کہ بشیر الدین صاحب ایک اچھے آرٹسٹ بھی ہیں، فوٹو گرافر بھی۔ رابندر بھارتی یونیورسٹی (کلکتہ) سے انھوں نے آرٹ میں ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ پھر خبر ملی کہ موسیقی سے انھیں بیحد رغبت ہے۔ طرح طرح کے آلات موسیقی سے ان کا کمرہ سجا ہوا ہے۔ کچھ دنوں بعد اطلاع آئی وہ ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے والے ہیں۔ اپنے گھر میں ریہرسل کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا تھا ان کے اندر کوئی بے چین روح ہے جو انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ اچانک ایک دن سر میں نہ جانے کیا سودا سما یا کہ نیا بازار میں کانکی نارہ کے چوراہے پر ایک دیوار گیر پرچہ ”متحرک“ کا اجرا کیا۔ اس کے ایڈیٹر وہ خود تھے۔ اس پرچے میں لکھنے والے سبھی محلے کے تھے۔ مقصد نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنا تھا، انھیں ادب کی جانب مائل کرنا تھا۔ یہ سمجھنا میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ بشیر الدین صاحب کو کس خانے میں فٹ کیا جائے۔ ایک طرح سے وہ ہر فن مولا تھے۔

بشیر الدین ظامی کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں کانکی نارہ میں ہوئی جو بنگال کا صنعتی علاقہ ہے۔ جہاں جوٹ ملوں کی بہتات ہے۔ ان کے والد حاجی محمد اسحاق سردار تھے جن کے نام پر کانکی نارہ کی گلی نمبر ۲، اسحاق سردار لین اور ایک مسجد ”مسجد اسحاق سردار“ کے نام سے موسوم ہے۔ زمین دار خاندان کا فرد ہونے کے ناتے بچپن ہی میں سماج کی اچھائیوں اور برائیوں کو مشاہدہ کرنے کا اچھا موقع ملا۔ اردو اور بنگلہ ان کی مادری زبانیں تھیں۔ مصوری، فوٹو گرافی اور مطالعہ ان کی مصروفیات کے سہارے تھے۔

ادبی دنیا میں ان کا داخلہ بحیثیت شاعر کے ہوا۔ احباب نے سمجھایا کہ یہ راہ بڑی دشوار ہے، پر خار ہے مگر یہ ان کا عزم تھا کہ اس مشورے کو ہنس کر ٹال دیا اور اسی کانٹوں بھری راہ پر چل پڑے۔ ۷

نقشِ دل کیجیے کسی کامل کی بات
کوئی مشکل ہی نہیں مشکل کی بات
عزم مستحکم ہے گر ظامی ترا
کیوں نہ طوفاں میں کرے ساحل کی بات

مذکورہ قطعہ ان کے عزم و ارادہ کی کہانی تھی، ہمت و حوصلے کا ترجمان تھا۔ اپنی رہائش کے لیے جب انھوں نے ”ڈریم لینڈ“ جیسی عمارت بنوائی تو دروازے کے اوپر پتھروں میں اس قطعہ کو جڑ دیا تا کہ عزم و حوصلہ کی کہانی دنیا کو معلوم ہوتی رہے۔
۱۹۸۳ء میں آزاد اسپورنگ کلب والوں نے ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس دن اسٹیج پر رنگ برنگی روشنیوں کا سیلاب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اسٹیج پر دائیں اور بائیں سے سرخ، سبز، نیلگوں، زرد، بیگنی، ارغوانی روشنیاں چھن چھن کر آرہی تھیں۔ مقصد تھا کہ شاعر جب اپنا کلام پڑھے تو اس پر رنگ و نور کی بارش ہوتی رہے۔ اس طرح کا انتظام خاکسار نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ سامعین حیران بھی تھے، خوش بھی۔ یہ سارا انتظام بشیر الدین ظامی کے زیر نگرانی کیا گیا تھا۔ آج تک خاکسار نے کسی بھی مشاعرے میں رنگ و نور کا ایسا حسین امتزاج نہیں دیکھا۔ اس زمانے میں ان کا ایک شعر کافی مشہور ہوا تھا۔

آبلہ پائی سے کانٹوں نے کہا ، واپس جا
دور منزل ہے بہت دور تمھیں کیا معلوم

ایک زمانے میں وحید عرشی، وفا سکندر پوری اور بشیر الدین ظامی ایک ادبی تہنوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ہر ادبی محفل میں ان کی موجودگی ناگزیر تھی۔ اس زمانے کا ایک یادگار سالانہ مجلہ ”غزل کی رات“ ہے۔ اس مجلہ کے مرتبین میں وحید عرشی، وفا سکندر پوری کے علاوہ بشیر الدین ظامی بھی شامل تھے تھا۔ عوام میں یہ مجلہ ”آکاش پتر-۷۷ء“ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں کانگی نارہ اور بھاٹ پاڑہ کی ابتدائی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ ادبی حلقوں میں اس مجلے کی کافی پذیرائی ہوئی تھی۔ کاشانہ ادب کے سالانہ طرحی مشاعرے (منعقدہ یکم دسمبر ۱۹۸۱ء بمقام حمایت الغرباء ہائی اسکول، کانگی نارہ) میں صدارت حشم الرمضان اور نقابت وحید عرشی کی تھی۔ پڑھی گئی غزل کے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔

گھر کی فسیل میں انھیں رہنا ہے قید اب
جو رہ گزر کے خوف و خطر مانگتے نہیں
ظامی یہ کہہ دو سب سے کہ آئیں ہمارے پاس
محفل میں صرف تنگ نظر مانگتے نہیں

نشر کی جانب بشیر الدین ظامی کی توجہ آٹھویں دہائی میں ہوئی۔ یہاں بھی وہی حوصلہ شکن حالات، راہ میں وہی خاردار جھاڑیاں، وہی بے رحم نقاد راستہ رو کے کھڑے تھے۔ اس منزل پر بھی ان کا عزم مستحکم کام آیا۔ ہمت نے بازو تھامے، عزم نے راہ کے کانٹے ہٹائے، یقین نے شمع جلائی، حوصلہ شکن نقادوں سے لاکا کر کہا۔

عزم کا قافلہ آگے بڑھتا رہا
لوگ آتے رہے لوگ جاتے رہے

۱۹۷۵ء میں ان کا پہلا ناول ”جھنور“ زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس

شاعر کے اندر ایک اچھا ناول نگار بھی چھپا ہوا ہے۔

مئی ۱۹۷۸ء میں ان کا دوسرا ناول ”نئی زندگی“ کے نام سے چھپ کر ان کی مقبولیت کا سبب بنا۔ جکتدل سے شائع ہونے والے رسالہ ”صدف“ (۱۹۸۶ء) ایڈیٹر قیوم بدر کے لیے ایک مئی کہانی ”زہریلے انسان“ لکھی جو بے حد متاثر کرنے والی تھی۔ اہل ادب نے اسے کافی سراہا۔ بشیر الدین ظامی جاگیر دارانہ حالات کے پروردہ تھے لیکن مزاج میں سادگی اور حق گوئی شامل تھی۔ مخالف کی غلط بات کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ منہ پر صاف صاف جواب دے دیتے تھے۔ کسی مصلحت یا سمجھوتہ کے قائل نہیں تھے (جونی زمانہ فیشن بن چکا ہے)

بنگل میں ناول نگاروں کی تعداد ہمیشہ اچھی خاصی رہی ہے جیسے بنکم چندر چٹرجی، سمریش باسو، تارا شکر بھرجی، سرت چندر چٹرجی، امیہ سانیاں وغیرہ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی بنگال کے اردو ادب میں ناول نگاروں کی تعداد انتہائی کم رہی ہے۔ ایسے عالم میں بشیر الدین ظامی کا ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھنا تعجب کی بات تھی۔ ان کی مادری زبان اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ بھی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ بنگلہ ادب کا انھوں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو اور بنگلہ ادیبوں کے گہرے اثرات انھوں نے قبول کیے ہوں۔ کہیں نہ کہیں بنگلہ ادب اور اردو ادب کے بیچ کوئی نکتہ اتصال ضرور رہا ہے۔ جب انھوں نے اپنا پہلا ناول ”بھنور“ لکھا تو بیشتر لوگوں کو حیرت ہوئی۔ تین برسوں کے بعد ۱۹۷۸ء میں جب ان کا دوسرا ناول ”نئی زندگی“ چھپ کر عوام کے سامنے آیا تو لوگ ان کی ناول نگاری کے قائل ہو گئے۔

اس ”بھنور“ نامی ناول میں ایک طوائف (رتنا بانی) کی حیاتِ معاشقہ بیان کی گئی ہے جو زمانے کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو کر حالات کے بھنور میں پھنس جاتی ہے۔ رمیش کی بانہوں کا سہارا پا کر رتنا اس بھنور سے باہر نکل آتی ہے۔ دوسری طرف کامنی (جو رمیش کی بیوی ہے) بھی گردشِ روزگار کا شکار ہو جاتی ہے۔ رتنا بانی کی قربانیوں سے بھنور میں پھنسی ہوئی کامنی کی کشتی کو ساحل مل جاتا ہے۔ کہانی میں پلاٹ ہے، کلائمکس ہے، اتار چڑھاؤ ہے۔ غرض وہ سب کچھ ہے جو ناول کا حصہ ہوتا ہے۔

ان کا دوسرا ناول ”نئی زندگی“ کا انتساب ماں کے نام ہے جسے وہ عقیدت کی حد تک چاہتے تھے۔ اس ناول میں ہیر و ہیر و ن دونوں آرٹسٹ ہیں۔ شیلہ امیر باپ کی بیٹی ہے جب کہ منیش کا تعلق غریب خاندان سے ہے۔ دونوں دیوانگی کی حد تک ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن غربت ان کے پیار کے بیچ دیوار بن جاتی ہے۔ امیری غریبی کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ منیش اس ٹکراؤ کی تاب نہیں لاپاتا اور گمنامی کی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور ایک غریب لڑکی کو اپنے زندگی کا ساتھی بنا لیتا ہے۔ شیلہ کی شادی ایک امیر لڑکے سے کر دی جاتی ہے لیکن تقدیر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔

دونوں کے بچے دیک اور وینا ایک ہی کالج (آرٹ کالج) میں پڑھتے ہیں۔ ان میں دوستی ہوتی ہے پھر انسیت پیار میں بدل جاتی ہے۔ شیلہ جو باپ کے مرنے کے بعد تنہا دولت، جائیداد کی مالک ہے، اپنی لڑکی وینا کے پیار کی خاطر دولت اور شان و شوکت کی دیوار کو توڑنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ دو پریمی بیاہ کے ریشمی ڈور میں بندھ جاتے ہیں۔ امیری غریبی کی دیوار ٹوٹ جاتی ہے۔ پیار کی جیت ہوتی ہے۔ ماں باپ کی وہ ناکام محبت اس طرح سے بچوں کے پیار میں ڈھل کر کامیاب ہو جاتی ہے۔ ”نئی زندگی“ کا میاب محبت کا پیغام لاتی ہے۔ زندگی کی نئی صبح نمودار ہوتی ہے۔ یہ دوسرا ناول پہلے ناول کی بہ نسبت زیادہ کامیاب ہے۔

ان کا تیسرا ناول ”ایثار“ جس میں ساج کے اندر ہونے والی نئی تحریکوں اور تہذیبی کردوٹوں کی بھرپور عکاسی کی گئی تھی،

اشاعت کی منزل سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

افسانوں کا ایک مجموعہ ”سپنوں کی راکھ“ کے عنوان سے منظرِ عام پر آتے آتے رہ گیا۔

موت بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ اس نے پروفیسر مجیب الحق، پروفیسر وحید عرشی پر بھی رحم نہیں کیا۔ بشیر الدین ظامی بھی اس کی بے رحمی کا شکار بنے۔ ایسے وقت میں انھیں موت کے بے رحم بچوں نے دبوچ لیا جب کہ انھیں ادب کے میدان میں بہت کچھ کرنا تھا۔

مومن خاں مومن اور شطرنج

انیسویں صدی کے درمیانی حصے کو اردو شاعری کے سنہرے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ذوق، مومن اور غالب جیسے باکمال شعراء دلی میں جمع ہو گئے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ روبہ زوال تھی۔ اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف جہاں دلی کی بساطِ سیاست الٹ رہی تھی، وہیں دلی کے ایک زبردست مہرے حکیم مومن خاں مومن کی بساطِ شطرنج جم رہی تھی۔ مومن ایک نابغہ روزگار شخص تھے۔ ذہانت و علمیت کے لحاظ سے وہ اپنے ساتھیوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

”شطرنج سے بھی ان کو کمال نسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔“

(آب حیات صفحہ ۲۳)

آگے چل کر مولوی آزاد لکھتے ہیں:-

”ان کی تیزی ذہن اور ذکاوت طبع کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصیتوں کے سوا کسی ہم عصر کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ ایک مولوی اسماعیل صاحب دوسرے خواجہ محمد نصیر جو کہ ان کے سر اور خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔ اس سلسلہ میں نواب مصطفیٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا ان کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی۔“ (آب حیات صفحہ ۲۳)

مومن کی ذہانت کے معترف مولوی فضل حق خیر آبادی بھی تھے:-

امیر الروایات کے مصنف امیر شاہ کا بیان ہے کہ:-

”مولوی فضل حق شطرنج بہت کھیلتے تھے اور یہ دونوں جب کھیلتے تھے تو مومن خاں بازی لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا غالب نے مولوی فضل حق سے کہا کہ آپ اس قدر ذہین اور طباع ہیں پھر کیوں مومن خاں مومن سے ہر بار مات کھا جاتے ہیں۔ مولوی فضل حق نے کہا کہ مومن خاں ایک بھیڑیا ہے۔ اسے اپنی قوت کی خبر نہیں۔ عشق و عاشقی کے قصوں میں پھنس گیا۔ اگر علمی مشغلہ میں پڑتا تو اس وقت اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی۔ فی الحقیقت نہایت ذہین آدمی ہے۔“ (صفحہ ۱۶۰)

اس حوالے سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مومن کی ذہانت کے معترف مولوی فضل حق خیر آبادی بھی تھے جن کا شمار اس زمانے کے ماہرینِ شطرنج میں کیا جاتا تھا۔

رام بابو سکسینہ کا بیان ہے:-

”شطرنج سے بھی ان کو (مومن) کمال نسبت تھی اور دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریب رکھتے تھے مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو انہوں نے ذریعہٴ معاش نہیں بنایا۔“

(صفحہ ۳۰۵- تاریخ اردو ادب)

مذکورہ بالا بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ حکیم مومن خاں مومن کو شطرنج سے کافی دلچسپی تھی۔ نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ وہ اس کھیل میں کافی دسترس بھی رکھتے تھے۔ دلی میں ان کے شاٹر ہونے کا ڈنکان بج رہا تھا۔ نامی گرامی ماہر شطرنج ان کی صلاحیت کا لوہا مانتے تھے۔

حکیم مومن خاں مومن کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ بیک وقت شعر و شاعری، طب، رمل، ریاضی، موسیقی اور شطرنج پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو متقاضی ہے کہ الگ سے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے۔ انہوں نے شاعری بچپن میں سیکھی، درس محبت بھی بچپن ہی میں مل گیا۔ طب کے ساتھ انہوں نے رمل اور نجوم بھی سیکھا۔ موسیقی سے لگاؤ تھا۔ شطرنج کھیلنے کا بھی مشغلہ رکھتے تھے۔ دوست احباب کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ مختلف رنگ کے دوست الگ الگ تھے۔

حکیم سکھانندان کو نجوم اور رمل سکھاتے، پھر ان سے شطرنج کھیلتے تھے۔ کرامت علی خاں شاطر، فضل حق اور شہزادہ رحیم الدین حیا یہ چاروں گیسوئے شطرنج کے اسیر تھے۔ ان میں شطرنج خوب کھیلی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ بھی مخلص دوست اور بے تکلف ساتھی جو ان کے دن رات کے ہم جلس تھے، ان میں صہبائی، مملوک علی، حکیم احسن اللہ خاں، محمد سعید خاں، تفضل حسین خاں شیفتہ، غلام علی وحشت اور غلام ضامن کرم تھے۔ صبح سے شام تک مومن ان ہی دوستوں کے درمیان دن گزارا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے شعر و شاعری پر بحث و مباحثہ کرتے اور شطرنج کھیلتے تھے۔

کرامت علی خاں سے مومن کو بڑی محبت تھی۔ چنانچہ دونوں روزانہ ملتے تھے اور شطرنج کی بازی بھی جیتی رہتی تھی۔ حکیم سکھانند ترم بھی شطرنج کے دلدادہ تھے۔ دن بھر بیٹھے شطرنج کھیلا کرتے۔ مولوی فضل حق بھی مومن سے مات کھا جاتے تھے مگر روز شطرنج کھیلنے آتے تھے۔ شہزادہ مرزا رحیم الدین حیا بھی مومن کے دیوان خانہ کے حاضر باشوں میں سے تھے۔ شطرنج کھیلتے اور ولایت سے جو نقشے شطرنج کے آتے، انہیں حل کرانے کے لیے مومن کے پاس لاتے تھے۔ غرض شطرنج کی صحبت مستقل تھی۔ دن بھر بساط کچھی رہتی تھی۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ شطرنج کے معاملے میں بھی مومن اپنے ساتھیوں پر فوقیت رکھتے تھے۔

شطرنج بلاشبہ ذہانت، یادداشت اور پیش بینی کا کھیل ہے۔ حکیم مومن خاں مومن ریاضیات میں کافی عمل دخل رکھتے تھے۔ ان کی یادداشت بھی کافی اچھی تھی۔ ذہین تو وہ تھے ہی۔ درج بالا حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ اس وقت دلی میں جتنے ماہرین شطرنج موجود تھے، مومن ان سب پر سبقت رکھتے تھے۔

شطرنج کی دنیا میں ورلڈ چمپین شپ کی تاریخ تقریباً ایک صدی پہلے بنی۔ میرا مطلب ۱۸۸۶ء سے ہے۔ اس سے قبل شطرنج بالکل غیر منظم حالت میں کھیلی جاتی تھی۔ ہر شاٹر جو اپنے علاقے میں دوستوں یا پڑوسیوں سے بازی جیت لیتا تھا وہ اپنے آپ کو چمپین کہنا شروع کر دیتا تھا۔ دنیا کا پہلا تسلیم شدہ چمپین بننے کا اعزاز (غیر سرکاری طور پر ہی سہی) امریکہ کے پال چارلس مرفی (Paul Charles Morphy) کو جاتا ہے۔ اس کے دس سال بعد ۱۸۹۶ء میں آسٹریا کے شاطر کھلاڑی اسٹائی نیز (Steinitz) نے سرکاری طور پر پہلا ورلڈ چمپین بننے کا خطاب حاصل کیا۔ یہیں سے شطرنج کے رہنما اصول اور دفاعی تکنیک کو نئی شکل دی گئی۔ شطرنج کو موجودہ زمانے کے مطابق نیارنگ نیا چہرہ عطا کیا گیا۔ تقریباً ۲۷ برسوں تک اسٹائی نیز شطرنج کی دنیا کا ہیرو بنا رہا۔ وہ ایک ماہر ریاضیات بھی تھا۔

اب آئیے ہم اس تناظر میں حکیم مومن خاں مومن کو دیکھتے ہیں۔ دیوان مومن مرتبہ ضیا احمد کے مطابق مومن کی

وفات ۵۳ رسال کی عمر میں ہوئی۔ پیدائش کا سال ۱۲۶۸ھ ہے۔ اس ہجری سال کو عیسوی میں بدلنے کے لیے ایک فارمولے کا استعمال ضروری ہے۔

$$\text{عیسوی سال} = ۶۲۲ + \text{ہجری سال} \times ۳$$

۱۰۰

حساب کے اس فارمولے پر مومن خاں مومن کی وفات کا سال عیسوی ۱۸۵۲ء نکلتا ہے۔ ۵۳ رسال کی عمر تک مومن حیات میں تھے۔ لہذا ان کی پیدائش کا سال ۵۲-۱۸۵۳ء = ۱۷۹۹ء ہے۔

پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ شطرنج کے عالمی چمپین شپ کی تاریخ ۱۸۸۶ء میں بنی۔ اس سے پہلے شطرنج غیر منظم حالت میں بغیر کسی رہنما کے کھیلی جاتی تھی۔ ۱۸۲۰ء تک مومن خاں مومن پوری طرح شطرنج میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ظاہری بات ہے یہ تمام کھیل غیر منظم انداز میں ہوتے تھے۔ کوئی سرکاری ادارہ یا تنظیم ایسی نہیں تھی جس کے تحت وہ شطرنج کے مقابلے میں شریک ہوتے۔ دلی کے مشہور شاطر فضل حق خیر آبادی ہوں یا کرامت علی خاں کرامت، سکھاندرقم ہوں یا شہزادہ رحیم الدین حیا سب پر مومن بھاری پڑتے تھے۔ مختلف حوالوں سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمام لوگ مومن خاں مومن کی شاطرانہ چالوں کے قائل تھے۔ مومن ریاضیات کے بھی ماہر تھے۔ یہ بات بھی اسٹائی نیز کی طرح مومن کے حق میں جاتی ہے۔ لہذا یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ مومن خاں مومن انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شطرنج کے تسلیم شدہ چمپین (غیر سرکاری طور پر ہی سہی) تھے۔ شطرنج سے متعلق کسی ادارہ یا تنظیم کا وجود ہوتا، مقابلہ جاتی کھیلوں کا اہتمام ہوتا تو مومن خاں مومن اس وقت دہلی میں شطرنج کے گرانڈ ماسٹر کا خطاب بھی حاصل کر سکتے تھے۔

شطرنج اور اردو شاعری

موجودہ دور میں کھیلوں کے جتنے بھی نمونے دستیاب ہیں انہیں دو بڑے خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک آسمان کے نیچے کھلی فضا میں کھیلے جانے والے کھیل اور دوسرے چہار دیواری میں چھت کے نیچے منعقد ہونے والے کھیل۔ اس دوسری قسم کے کھیلوں میں شطرنج کو بلاشبہ ایک باوقار اور تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ کھیل راجاؤں اور بادشاہوں میں بہت مقبول رہا ہے۔

شطرنج کے اسیران:- البیرونی کی تحریر سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شطرنج ہندوستان میں زمانہ قدیم سے رائج ہے۔ البیرونی کے بیان کی تصدیق اکثر مورخین سے ہو جاتی ہے۔ عہد اسلامی میں سلاطین کا شوق و انہماک شطرنج سے کافی تھا۔ یزید بن عبد الملک اور ہشام، ہارون رشید اور اس کے دونوں لڑکے امین الرشید اور مامون الرشید، محمود غزنوی، المستنصر باللہ، یوسف صلاح الدین، تیمور لنگ، جلال الدین محمد اکبر اور سلطان عبد الحمید وغیرہ شطرنج کے بڑے شوقین اور اچھے کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔ وزیروں میں جعفر برکی، ابوبکر بن زہر اور ابوبکر بن عماد، وزیر علی القمی وغیرہ اس کھیل کے ماہر تھے۔

اردو کے صاحب طرز اور اپنے رنگ کے منفرد شاعر حکیم مومن خاں مومن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شطرنج کے بڑے ماہر تھے اور اس زمانہ کے زیرک شاطروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اودھ کے واجد علی شاہ کا دور شطرنج کے کھلاڑیوں کے لیے کافی سازگار رہا۔ مغلیہ دور کے بادشاہوں اور وزیروں نے اس کھیل کی آڑ میں اپنے لیے تفریح و دل بستگی کا سامان فراہم کیا اور مہروں کے خانوں میں حسین و جمیل کنیروں کو کھڑا کر کے اپنے ذوق طبع کی تسکین کی۔

شطرنج کا اثر محاورات اور اردو شاعری پر:- روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو تمثیل کے طور پر مختصر لفظوں میں بتانے کے لیے عام طور پر محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال ہوتا ہے جس سے سننے والا عموماً مانوس ہوتا ہے۔ اس طرح سے محاورے اور ضرب الامثال وجود میں آتے ہیں۔ صدیوں پر محیط تہذیب و ثقافت ان محاوروں یا ضرب الامثال کے ذریعہ زندہ رہتی ہے۔

ہمارے ملک میں زمانہ قدیم سے شطرنج کھیلی جاتی رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں بہت سارے الفاظ اور محاورے اردو زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ مثال کے طور پر شہرہ دنیا، بازی مارنا، مات دینا، چال چلنا، مہرہ بننا۔ صدیوں سے قابل استعمال یہ محاورے یا الفاظ اردو زبان میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ اور محاورے شطرنج کے کھیل سے آئے ہیں۔

شطرنج کے ایک بار کے کھیل کو بازی کہتے ہیں۔ اب مشاہدہ کیجیے کہ اس بازی لفظ سے کتنے سارے محاورے، الفاظ، اشعار وجود میں آ گئے۔ بازی مارنا، بازی لگانا، بازی گر، بازیچہ، بساط اللنا، بساط بچھنا وغیرہ۔

بازیچہ پر غالب کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یہاں یہ بات واضح رہے کہ ”مولوی محمد معظم غالب“ کے باضابطہ استاد تھے۔ انہوں نے غالب کو فارسی ادب، شطرنج اور فلسفے کا درس دیا۔“ (صفحہ ۳۸۔ ”انشاء“ مارچ ۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر فریاد آذر کا شعر ہے۔

زندگی اس تری شطرنج کی بازی سے بہت
تھک گیا ہوں میں ، شہہ و مات سے آزادی دے
معروف ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر لکھتے ہیں۔
ہم سے اک بار بھی جیتا ہے نہ جیتے گا کوئی
یوں تو ہم جان کے کھا لیتے ہیں ماتیں اکثر
استاد شاعر طرفہ قریشی ناگ پوری فرماتے ہیں:

میں بساطِ شوق بچھاؤں کیا، غمِ دل کی شرط لگاؤں کیا
جو پیادہ چلنے میں طاق تھے ، وہ تمام مہرے بکھر گئے
قیصر شمیم کسی ماہر شطرنج کے لہجے میں طمطراق سے گویا ہیں۔

اک پل میں ہم جو چاہیں رکھ دیں بساط الٹ کر
شہہ زد پہ آپکا ہے ، اپنا پیادہ رکھے
ابھی شطرنج ہے جاری ، ذرا الٹے تو بساط
دیکھنا کون ہے شہہ ، کون پیادہ ہے میاں
”چال چلنا“ شطرنج کے کھیل ہی سے نکلا ہے۔ چال میں آنا، چال پر پڑنا وغیرہ۔
کوثر پروین کوثر کا شعر ہے۔

شہہ سے پہلے نہ مات ہو جائے
دیکھ چال اس کی شاطرانہ ہے
بہادر شاہ ظفر محتاط انداز میں کہتے ہیں۔

ہوشیاری سے سمجھ کر چال چلنا چاہیے
کارِ دنیا بھی ظفر شطرنج کا سا کھیل ہے
پروفیسر نصر غزالی کا رنگ کچھ اور ہے۔

اسی کے سارے پیادے ، اسی کے شاہ و وزیر
بساطِ زیست پہ شہہ اسی کی چال کا ہے
احمد کمال شمیم نے ”چال چلنا“ پر عمدہ شعر کہا ہے۔

وزیر چپ کھڑا تھا اور شہہ کو مات ہوگئی
بساطِ زیست پر پیادہ چال ایسی چل گیا

خاکسار (زماں قاسمی) کا شعریوں ہے۔

زد میں آسکتا ہے دشمن کا وزیر
عقل کا گھوڑا اڑا کر دیکھیے!

لفظ ”شہہ“ اور ”مات“ سے متعدد محاورے اختراع کیے گئے ہیں مثلاً شہہ دینا، شہہ پڑنا، مات دینا، مات ہونا وغیرہ۔
اس شہہ اور مات پر کچھ مشہور شعراء کے اشعار پیش خدمت ہیں۔

ہر سمت سے گھر آئے ہیں شطرنج کے مہرے
یہ دیکھ! ابھی شہہ ہے، ابھی مات برادر
(نشرت خانقاہی)

زندگی مہرہ ہے اک شطرنج کا
موت کیا ہے زندگی کی مات ہے
(انجم بارودی)

راستے بھاگنے کے سب مسدود
شاہ بھی ہے وزیر کی شہہ پر
(مجیب اختر)

مات ہو جاتی ہے پیادے سے بھی شہہ کی اکثر
ہم نے دیکھا ہے زماں مات سے پہلے پہلے
(زماں قاسمی)

فرزین کے لیے گھر کھلنا، بیدل کا کٹنا پر شعر پروفیسر مظفر حنفی کو ہی زیب دیتا ہے۔ ان کا یہ شعر حقیقت کا اظہار بھی ہے
اور دل کو چھو لینے والا بھی۔

کٹ جائیں یہ بیدل تو نکل آئیں گی راہیں
فرزین کے لیے ورنہ کوئی گھر نہیں کھلتا
شطرنج کا سارا کھیل مہروں کی چال پر منحصر ہوتا ہے۔ مہرے چونکہ بے بس ہوتے ہیں اور ان کا عنان گیر کوئی اور ہوتا
ہے اس لیے ہماری زبان میں کسی کا مہرہ بننا محاورہ مستعمل ہوا۔

خانے میں ہے شطرنج کے جب تک، ہوں پر امید
جب پٹ گیا مہرہ تو کہیں کا بھی نہیں ہے
(جیل تمنائی)

سیاست کی دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ منور رانا جیسی بھاری بھر کم شخصیت معمولی مہروں (پیادوں) سے پٹ جاتی ہے۔
عجیب کھیل ہے دنیا تری سیاست کا
میں پیدلوں سے پٹا ہوں وزیر ہوتے ہوئے

پروفیسر نصر غزالی نے تو بساط ہی کو الٹ کر رکھ دیا۔

جب بساط الٹی تو جانا کہ تھے شاطر کتنے؟
کشتی و فیل و پیادہ پہ تھے قادر کتنے؟
کپڑے یا کاغذ کے جس چوکور ٹکڑے پر شطرنج کھیلی جاتی ہے، اسے بساط کہتے ہیں۔ اس لفظ سے بساط ہونا محاورہ بنا
مثلاً اس کی بساط ہی کیا تھی جو اتنا بڑا کام کر جاتا؟۔ ذوق نے اس لفظ کو کس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔
کم ہوں گے اس بساط پہ مجھ جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے
شطرنج میں پیادہ سیدھا چلتا ہے جب کہ فرزیں (وزیر) ٹیڑھا بھی چل سکتا ہے۔ ترقی اور کامیابی پا کر آدمی کے اندر جو
غرور یا ٹیڑھا آ جاتی ہے، اس کے اظہار کے لیے عبدالرحیم خان خانان نے مہروں کی ان چالوں سے استفادہ کرتے ہوئے کہا ہے۔
پیادہ سے فرزیں بھیوٹیڑھوٹیڑھو جائے

آج کی دنیا میں شطرنج کھیلنے کا ہر شعبہ حیات میں استعمال ہو رہا ہے۔ خاص طور پر سیاست کے میدان میں۔ جیسے جیسے
تعلیم حاصل کرنے کا شوق بڑھتا جا رہا ہے، شطرنج ہر مرحلے پر کھیلی جانے لگی ہے۔ بساط بچھانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، صرف اپنا
مہرہ بڑھادینا کافی ہوتا ہے۔ بزرگ شاعر علقمہ شبلی فرماتے ہیں۔

میں نے دیکھا ہے پیادوں کو بھی آگے شبلی
شاہ کو ، مان لوں کیوں ، مات نہیں ہو سکتی
راقم (زماں قاسمی) کو چونکہ شطرنج سے کافی شغف ہے لہذا اس لیے اس موضوع پر اشعار کا معرض وجود
میں آنا فطری امر ہے۔

کتنے ماہر ہیں زماں شطرنج میں
ایک دن بازی جما کر دیکھیے

اس قدر مربوط تھیں مہروں کی چالیں دوستو
ہر گھڑی مجھ کو خود اپنی ہار کا خدشہ رہا

وائے وحشت! اسپ و فرزیں ، فیل و رخ سب پٹ گئے
جذبہ جوش ظفر قائم انہیں مہروں پہ تھا
رئیس الدین رئیس نے اپنا ارادہ اس طرح سے ظاہر کیا ہے۔

کاش شطرنج پہ ظاہر ہو ارادہ میرا
شاہ کو پیٹنے نکلا ہے پیادہ میرا
فراغ رو ہوئی کا انداز دیکھیں۔

شاہ بھی آچکا مری زد میں
تو فقط جانبِ وزیر نہ دیکھ
ہمدنعمانی کے پیدل کا جب مزاج بگڑتا ہے تو اس طرح کا شعر وجود میں آتا ہے۔
اسپ و فرزین، فیل و رخ رہ جاتے ہیں ششدر سبھی
جب بگڑ جاتا ہے ہمدن میرے پیدل کا مزاج
نسیم فائق کا شعر، شعر نہیں چیلنج ہے۔

مرے پیادوں کے سامنے اب
تو اپنے شاہ و وزیر لے آ
ارشاد جمال شہمی وزیر پر پیادہ کو ترجیح دیتے ہیں۔
کماں نہ رکھے اگر اک بھی تیر باقی ہے
پیادہ ہے تو سمجھیے وزیر باقی ہے
فتح کا جشن منانے والے تو بہتر مل جائیں گے لیکن جان بوجھ کر ہارنے والے؟ آئیے ایوب رضا (جکٹدل) کا
ظرف دیکھتے ہیں۔

ظرف ہمارا شیوہ ہے اور دل داری ہے فطرت اپنی
ہم نے تو شطرنج کی بازی جان کے اکثر ہاری ہے
مات تو ہر مقابلے کا لازمی حصہ ہوتا ہے لیکن مات سے پہلے شہہ دے کر حریف کھلاڑی کو گھیرے میں لینا اور شکست
قبول کرنے کے لیے مجبور کرنا صرف شطرنج میں ہی ممکن ہے۔ ادب میں شطرنج کو جو مقام حاصل ہوا ہے اس کا سارا کریڈٹ
اردو کے شعراء حضرات کو ملنا چاہیے۔ منشی پریم چند بھی اس کریڈٹ کے حقدار ہیں جنہوں نے ”شطرنج کے کھلاڑی“ کی تصنیف
کی۔ ستیہجیت رائے کو بھی کریڈٹ ملنا چاہیے جو اس فلم کے ڈائریکٹر تھے جسے فلم فستیول میں کئی انعامات ملے۔

چونسٹھ خانوں اور بتیس مہروں کا کھیل

شطرنج ذہانت، یادداشت اور پیش بینی کا کھیل ہے۔ اس کھیل میں عمر، صنف، ذات، نسل کی کوئی قید نہیں۔ آج اس کھیل کے سحر میں کیا آرٹسٹ (Artist)، کیا پروفیسر، کیا فلسفی، کیا طالب علم اور کیا شوقیہ کھیلنے والے غرض سبھی گرفتار ہیں۔ کھیل کا جادو ان سب کے سرچڑھ کر بول رہا ہے۔

شطرنج کا کھیل زمانہ قدیم سے ہمارے ملک میں ہر و عزیز اور مقبول رہا ہے۔ اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ موجودہ شطرنج سے مشابہ ایک کھیل چھٹویں اور ساتویں صدی میں کھیلا گیا تھا۔ شطرنج آج ایک بین الاقوامی کھیل ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے۔ اس کھیل کا رواج کب اور کیسے ہوا، یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کھیل کی ایجاد لنکا (موجودہ سری لنکا) کے راجہ راوون کی ملکہ مندودری نے اس مقصد سے کی تھی تاکہ اس کا شوہر راوون اپنا سارا وقت جنگ میں نہ صرف کر سکے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ راوون کے فرزند میگھناد کی زوجہ نے اس کھیل کی شروعات کی تھی۔ روایت کچھ بھی ہو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کھیل کی شروعات زمانہ قدیم میں (چھٹویں اور ساتویں صدی میں) ہندوستان میں ہوئی۔ سرولیم جونسن نے ۹۰ء میں ایشیا ٹک سوسائٹی کے لیے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ ہندوستان ہی شطرنج کا مولد ہے۔ ہندوستانی ادب میں اس کا سب سے پہلا تذکرہ ساتویں صدی کے سنسکرت گرنٹھ واسودتا میں ملتا ہے جس کے مصنف سوبندھو ہیں۔ بان بھٹ کی مشہور تصنیف ”ہرش چرت“ میں بھی چترنگ کے نام سے اس کھیل کا تذکرہ موجود ہے۔

قدیم شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک شاہی کھیل تھا۔ اس کھیل میں تفریح کے ساتھ ساتھ عقل و ذہانت میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔ قدیم زمانے میں فوج کے چار حصے (انگ) ہوتے تھے یعنی پیدل، گھوڑ سوار، رتھ اور ہاتھی۔ اسی مناسبت سے چار انگ والے کھیل کو ”چترنگ“ (یعنی فوج کا کھیل) کہا گیا۔ اس کے قوانین بھی بہت کچھ جنگ کے اصولوں پر قائم ہیں۔ ہندوستان سے شطرنج کا کھیل آہستہ آہستہ ہمسایہ ملکوں میں پہنچا۔ پہلے ایران گیا، پھر عہد وسطیٰ میں اسلام کے فروغ کے ساتھ یہ کھیل مغربی ایشیاء کے ممالک خاص طور پر عرب ملکوں میں پہنچا۔ خلفائے بغداد کے عہد میں اس کھیل کو کافی شہرت اور مقبولیت ملی۔ اس طرح اس کھیل کا دائرہ ہندوستان، ایران، بغداد ہوتے ہوئے لاطینی امریکہ تک پھیل گیا۔ یورپ میں سب سے پہلے اس کھیل کو متعارف کرانے والے مسلمان ہیں۔ تیرہویں صدی تک یہ کھیل پورے مغربی یورپ میں کھیلا جانے لگا تھا۔ اس وقت تک اس کھیل کے قوانین میں تھوڑی بہت تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔

آج شطرنج (CHESS) کا لفظ ایک آفاقی نام بن چکا ہے۔ فارسی میں اس کا استعمال شترنگ کے نام سے ہوا اور لسانی شکست و ریخت کے مرحلے سے گزرتے ہوئے عربی زبان میں شطرنج بن گیا۔ ماضی میں شطرنج کے کئی نام تھے۔ ہندوؤں نے اسے چتورنگا (Chaturanga) کہا۔ بنگالیوں نے اس کا نام دابہ رکھا۔ قدیم فارس والے شطرنج کہتے تھے۔ رومنوں کے نزدیک اس کا نام لوڈس لیٹرم کولورم تھا۔ چینیوں نے اسے ”چونگ سکی“ کہا۔ انگریزوں کا دیا ہوا نام ”چیک“

تھا۔ فرانسیسیوں نے اسے اسپیکٹ کہا۔ آج تک ماہرین شطرنج اس بات پر متفق نہیں ہو سکے ہیں کہ چیس Chess کا لفظ انگریزی Check سے لیا گیا ہے یا فرانسیسی Echec سے۔ تاہم ایک بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ چیک کا لفظ عربی/فارسی کے ”شہ“ سے اخذ کیا گیا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کے نزدیک ”شہ مات“ ایک لفظ تھا جس کو وہ کھیل کے خاتمہ پر بولا کرتے تھے۔ آج چیک میٹ ”Check Mate“ کا لفظ اسی شہ مات کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اگر ہم ”میٹ“ Mate کا متبادل ”مات“ مان لیں تو ”چیک“ خود بخود شہ بن جاتا ہے۔

شطرنج کے کھیل میں مختلف اشکال کے دورنگوں والے لکڑی وغیرہ کے مہرے ہوتے ہیں۔ ایک سیاہ، دوسرا سفید۔ ان کی تعداد سولہ، سولہ ہوتی ہے۔ ایک فریق کے سولہ مہروں میں ایک بادشاہ، ایک وزیر (فرزین)، دو رخ، دو فیل اور دو گھوڑے ہوتے ہیں۔ پیادوں کی تعداد آٹھ ہوتی ہے۔ سارے کھیل کا انحصار انہیں مہروں کی چال پر ہوتا ہے۔

فی الحال شطرنج کے اس کھیل پر روس کو بالادستی حاصل ہے۔ انڈورگیم کی حیثیت سے اس کھیل کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور ملک میں اسے قومی درجہ کا کھیل قرار دیا جا چکا ہے۔ ۲۱ کروڑ روسی باشندوں میں آج تقریباً ۳۰ لاکھ باشندے شطرنج کے بلاناغہ کھلاڑی ہیں۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کھیل کے بہتر انتظامات کیے گئے ہیں۔ گیری کا سپاروف جس کا تعلق روس سے ہے، کے سرپرورلڈ چیمپئن شپ کا تاج تقریباً دس برسوں سے مسلسل جگمگا رہا ہے۔ برطانیہ میں ہونے والے مقابلوں کی تعداد ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں پانچ گنا بڑھ چکی ہے۔ اہل امریکہ آج اس کھیل پر پوری توجہ دیتے ہوئے ہیں جس کی زندہ مثال گاتا کا مسکی اور بانی فشر ہیں۔ یہ وہی بانی فشر ہے جس نے ۱۹۷۲ء میں اپنی شاطرا نہ چالوں سے پوری دنیا کو ششدر کر دیا تھا۔ دیکھا جائے تو اس کھیل سے لوگوں کی صحیح دلچسپی ۱۹۷۲ء کے ورلڈ چیمپئن شپ کے مقابلے سے ہی پیدا ہوئی جو کہ آئس لینڈ کے رجباک نامی مقام پر کھیلا گیا تھا۔ اس مقابلے میں امریکن چیلنجر بانی فشر نے اس وقت کے روسی چیمپئن بورس اسپاسکی کو ہرا کر اہل روس کی شطرنج پر پچیس برسوں کی بالادستی کو ختم کر دیا تھا۔ ساری دنیا میں اس مقابلے سے تہلکہ مچ گیا تھا۔ فشر کو اس مقابلے میں کل ایک لاکھ چھپن ہزار ڈالر (جن کی مجموعی قیمت ہندوستانی کرنسی میں تقریباً اٹھائیس لاکھ چھیالیس ہزار روپے ہوتی ہے) ملے تھے جو شطرنج کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ آج پچیس سال بعد امریکہ کا GATA KAMSKY گاتا کا مسکی کی موجودہ عالمی تنظیم ”FIDE“ (Federation, International DE) کے چیمپئن اناطولی کارپوف Anatoly Karpov کو چیلنج کر رہا ہے۔ یہاں ایک بات اور واضح رہے کہ ”PCA“ (Professional Chess Association) بھی شطرنج کی ایک متوازی عالمی تنظیم ہے اور دنیا کے شہرت یافتہ گرانڈ ماسٹر گیری کا سپاروف Gary Kasparov فی الحال اس کے چیمپئن گویا عالمی سطح پر اس وقت دو چیمپئن ہیں۔ کارپوف اور کا سپاروف دونوں تنظیموں کو یکجا کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

ہمارے ملک کی توجہ اس کھیل کی جانب آزادی کے پانچ چھ برسوں کے بعد مبذول ہوئی ہے۔ فی الحال ہر سال قومی مقابلے منعقد کیے جا رہے ہیں۔ آج وشواناتھن آنند جنہیں ہندوستان کا پہلا گرانڈ ماسٹر بننے کا اعزاز حاصل ہوا ہے، کا نام کون نہیں جانتا۔ پوری دنیا میں ان کے نام کا شہرہ ہے۔ ان کے کھیلوں کا باریک بینی سے تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت عالمی چیمپئن گیری کا سپاروف کے بعد آنند کا ہی نام لیا جاتا ہے۔ قومی کھلاڑیوں میں دیپنند و بروا، ٹی این پریمیشورن، پروین تھپسے، روی شیکھر، نیرج مشرا، شیکھر ساہو وغیرہ سے ہندوستان کو کافی امیدیں وابستہ ہیں۔ خاص طور پر کم سن کھلاڑی سورج شیکھر گنگولی

پر نہ صرف بنگال کی بلکہ پورے ملک کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ آنے والے دنوں میں سورج شیکھر اپنے نام کی طرح شطرنج کے افق پر سورج بن کر چمکے گا اور دیکھنے والوں کی نگاہیں چکاچوند ہو جائیں گی، ایسا میرا یقین ہے۔

ہر شاطر کے کھیلنے کا ایک الگ انداز ہوتا ہے۔ بعض کھلاڑی روس کے میخائل ٹال کی طرح حملہ آور گیم کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ بعض پڑوسیوں کی طرح محتاط گیم کھیلتے ہیں۔ فشر اور اسپاسکی کا کھیل کلاسیکل ہوتا ہے، صاف ستھرا۔ اس میں کوئی جنونی حرکت نہیں ہوتی۔

شطرنج کی بات آتی ہے تو ہم بابی فشر، میخائل ٹال، بوٹیوینیک، کاپابلانکا، اسٹائی نیر، الیکسن اور دوسرے ماہر شاطروں کی مثال دیتے ہیں۔ ان کے کھیل کی تکنیک، اسٹائل اور حاضر دماغی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ البتہ ہمارے اندر مایوسی اور ناامیدی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے جب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ماہرین شطرنج کے اس کہکشاں میں کسی بھی ہندوستانی کھلاڑی کا نام نہیں۔ ہم ان کی تعریف تو کر سکتے ہیں لیکن ان پر فخر نہیں کر سکتے کیونکہ فخر کا احساس ملکیت سے ہوتا ہے۔ ایسے عالم میں جب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ میر سلطان خان جو غیر منقسم ہندوستان کے ایک ایسے کھلاڑی تھے جنہوں نے ۱۹۳۴ء میں اپنے سحرانگیز کھیلوں سے اہل مغرب کو تھڑا دیا تھا اور اس وقت کے ماہر شاطروں کو ان کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا تھا تو ہمارا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں یہ ایک قومی فخر ہے۔ حالیہ برسوں میں ہمارے کھلاڑیوں خاص طور پر وشوانا تھ آنند نے اس بات کی کوشش کی کہ ملک کا وقار اہل مغرب کے مقابلے میں بلند کیا جاسکے۔ پیش رفت ضرور ہوئی ہے لیکن اطمینان بخش نہیں۔

شطرنج صرف یادداشت کا ہی نام نہیں۔ اگر ہر کھلاڑی ساری چالیں یاد رکھ سکتا تو آج دنیا کی اربوں آبادی میں صرف ڈیڑھ سو ماہر شاطر نہ ہوتے۔ شطرنج یادداشت سے بڑھ کر ہے۔ اس میں انسان کی ذہنی قوتیں برسرِ پیکار ہوتی ہیں۔ ماہر شاطر دوسروں سے مختلف انداز میں سوچتا ہے۔ وہ ماہر اس لیے ہے کہ اس کی ہر چال غیر متوقع ہو سکتی ہے۔

شطرنج کے ماہر کھلاڑی عام طور پر تیس سال سے کم عمر کے ہیں۔ جسمانی تقاضوں کے باعث یہ کھیل نو جوانوں کے لیے ہے۔ عمر رسیدہ لوگ جلد تھک جاتے ہیں۔ ان کے لیے کھیل کے اتار چڑھاؤ کو یاد رکھنا، بساط کو گھنٹوں گھورتے رہنا اور بیک وقت کئی کئی چالوں کے امکانات پر غور کرتے رہنا صرف دشواری نہیں پریشان کن بھی ہوتا ہے۔ ذہین ترین شاطر بھی دو تین چالوں سے زیادہ آگے نہیں سوچ سکتا۔ یہ کہنا کہ فلاں شاطر دس پندرہ چالیں پیشگی سوچ لیتا تھا، محض افسانہ ہے کیونکہ عملی طور پر ایسا ناممکن ہے۔ دو چار چالیں سوچنے سے ہی ذہن/دماغ پر اتنا زور پڑتا ہے کہ انسان مشکل سے برداشت کر پاتا ہے۔ دماغ اٹنے لگتا ہے۔ ڈاکٹروں نے تجربہ کیا ہے کہ مقابلہ جاتی کھیلوں میں خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ نبض تیز چلنے لگتی ہے۔ سانس بے قاعدہ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وقت کی پابندی اور ہر لمحہ گھڑی پر نظر بھی اعصاب کو شکستہ کر دیتی ہے۔

شطرنج کا کھیل دیکھا جائے تو سائنس بھی ہے اور آرٹس بھی۔ سائنس اس لحاظ سے کہ یہ کھیل چند غیر مبذل اصولوں اور قوانین پر مبنی ہے۔ آرٹس اس لحاظ سے کہ اگر آپ کا حریف غلطی کرے تو آپ فنکارانہ طریقے سے اس کی گرفت کر سکتے ہیں۔

وشوانا تھ آنند نے ستمبر ۲۰۰۸ء میں جرمنی میں کھیلے جانے والے عالمی چیمپئن شپ کے مقابلے میں ایک بار پھر سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور ورلڈ چیمپئن شپ کا خطاب اپنے نام کر چکے ہیں۔ شطرنج کی دنیا میں اپنا سکہ جماتے ہوئے آنند نے تیسری مرتبہ عالمی چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ ہندوستان کے لیے یہ بہت فخر کی بات ہے۔ اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں کھیلے جانے والے اس کھیل شطرنج کا جادو ایران، بغداد، لاطینی

امریکہ، یورپ اور روس ہوتے ہوئے پھر سے ہندوستان کے سرچڑھ کر بول رہا ہے ۔
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

حوالے :

- (۱) اردو ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۷۵ء
- (۲) راشٹریہ سہارا، فروری ۱۹۹۲ء
- (۳) صدف ۱۹۸۶ء
- (۴) آج کل، دہلی، اکتوبر ۱۹۹۱ء
- (۵) یا ترک، جون ۱۹۷۹ء
- (۶) (R.L.Mitchel) How to play chess
- (۷) (C.K.Sukul) Three ways of chess

ہندوستان میں شطرنج کے چند مسلم کھلاڑی

دنیا میں اس وقت جتنے بھی انڈورگیمس رائج ہیں ان میں شطرنج کو ایک خاص مقام اور مقبولیت حاصل ہے اس لیے کہ شطرنج انسانی ذہن کے امتحان اور اس کی صلاحیت کو جانچنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس سحر انگیز کھیل کی جانب ہمارے ملک نے آزادی کے پانچ چھ برسوں بعد بھرپور توجہ دی ہے۔ فی الحال ہر سال قومی مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان مقابلوں میں دیگر اقوام کے علاوہ مسلم کھلاڑی بھی انتھک کوششیں کر رہے ہیں تاکہ وہ بھی دوسروں سے پیچھے نہ رہیں لیکن افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ نئی نسل کی جس تعداد کو سامنے آنا چاہیے تھا، وہ اب تک مفقود ہے۔ پھر بھی جو نام اب تک ابھر کر سامنے آئے ہیں اور مختلف کھیلوں میں جیسی کارکردگی کا مظاہرہ انھوں نے کیا ہے، اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل مایوس کن نہیں ہے۔

آزادی کے بعد کے پہلے دہے میں محمد حسن اور ناصر علی کا نام منظر عام پر آیا۔ ان میں محمد حسن کا تعلق آندھرا پردیش سے اور ناصر علی کا تعلق اتر پردیش سے تھا۔ دوسرے دہے میں ناصر الدین غالب نے شطرنج کا پرچم بلند رکھا۔ غالب کا تعلق بھی آندھرا پردیش سے تھا۔ تیسرے دہے میں جو کھلاڑی عزت و افتخار کا باعث بنے ان میں رفیق خان اور عبدالجبار کا نام سرفہرست ہے۔ رفیق خان کا تعلق مدھیہ پردیش سے اور عبدالجبار کا تعلق مہاراشٹر سے تھا۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آزادی سے تیرہ چودہ سال قبل جس کھلاڑی نے نہ صرف غیر منقسم ہندوستان بلکہ یورپ وغیرہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا اور ان پر اپنی دھاک بٹھادی تھی، وہ ایک مسلمان تھا۔ اس کا نام میر سلطان خان تھا۔

یہ میر سلطان خان تھے جنھوں نے ۱۹۳۴ء میں اپنے دل فریب، سحر انگیز اور جارحانہ کھیلوں سے اہل مغرب کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت نہ جانے کتنے ماہرین شطرنج کو میر سلطان کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا تھا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ پھر سے کوئی میر سلطان کی اسپرٹ لے کر پیدا ہو اور ایک عالم کو مسخر کر لے۔ ذیل میں چند مشہور مسلم کھلاڑیوں کا تعارفی خاکہ پیش خدمت ہے جن کی خدمات اس میدان میں ناقابل فراموش ہیں۔

محمد حسن:

پیدائش حیدرآباد کی ہے۔ سنہ پیدائش ۱۹۲۷ء ہے۔ چھ سال کی عمر میں اپنے والد مرحوم محمد حسین سے شطرنج کا پہلا سبق لیا۔ معاش کے سلسلے میں حیدرآباد کیمیکل اینڈ فرٹیلائزرز سے وابستہ ہیں۔ ورلڈ چیمپین Tigran Petrosian جو اپنے ناقابل شکست دفاع کے لیے مشہور ہے، ان کے پسندیدہ کھلاڑی ہیں۔

۱۹۷۶ء میں بھیلواڑہ ٹرافی کے مقابلے میں شریک ہو کر پہلا پوزیشن حاصل کیا۔ اس مقابلے میں محمد حسن کو ۱۳ کھیلوں میں کل ۹ پوائنٹ حاصل ہوئے اور انعام میں ۴۰۰۰ روپے کی رقم ہاتھ آئی۔ اسی سال بمبئی میں منعقد آل انڈیا اوپن چیس

چمپین شپ میں بھی پہلا مقام حاصل کیا۔ اس مقابلے میں شامل ہونے والوں کی کل تعداد ۳۲۰ تھی اس کے باوجود حسن نے ساڑھے بارہ پوائنٹ حاصل کر لیے۔ اس کامیابی پر بمبئی پر دیش کانگریس کے صدر شری رجنی ٹیل کے ہاتھوں ۵۰۰۰ روپے کا انعام ملا جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

۱۹۷۷ء میں چیس اولمپیاڈ (ورنا) اور ایشین ٹرون (تہران) میں بالترتیب پہلا اور دوسرا مقام حاصل کرنے کا بھی فخر انھیں حاصل ہے۔

سید ناصر علی:

ان کا تعلق کانپور (یوپی) سے ہے۔ پیدائش ۱۵ اگست ۱۹۱۰ء کی ہے۔ بیس سال کی عمر میں عادل رشید سے شطرنج سیکھی۔ ۱۹۵۷ء میں پہلی بار ریاستی سطح پر ابھرے۔

ورلڈ چمپین الیکز نڈر الیکھن (Alexander Alekhine)، میخائل بوٹونیک (Mikhail Botvinnik) اپنے حملہ آور اور طوفانی کھیلوں کے سبب ناصر کے پسندیدہ شاطر ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں نیشنل چمپین ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اب تک ایشین ٹرونل (تہران) میں حصہ لے چکے ہیں۔ ۱۹۷۶ء کے بھیلواڑہ ٹرائی میں دوسرا مقام حاصل کیا تھا۔ (پہلا مقام محمد حسن نے حاصل کیا تھا)۔ انھیں انعام کے طور پر ۳۰۰۰ روپے ملے۔

ناصر الدین غالب:

پیدائش ۲۳ جنوری ۱۹۴۵ء کی ہے۔ جائے پیدائش حیدرآباد۔ شطرنج کا چھکا پندرہ سال کی عمر میں لگا۔ محرک اے اے علوی تھے۔ ورلڈ چمپین میخائل ٹال، گرانڈ ماسٹر میخائل بوٹونیک کے حملہ آور کھیلوں سے کافی متاثر ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں بھیلواڑہ ٹرائی پر قبضہ کیا۔ ۱۹۷۶ء میں کلکتہ کے نیشنل اے چمپین شپ میں گرچہ ان کا مقام چھٹواں تھا لیکن پرمیشورن کے خلاف ”ذہانت کا کھیل“ پیش کرنے پر بھیلوارہ گروپ نے انعام سے نوازا۔ ۱۹۷۷ء میں گرگام اوپن چمپین ٹورنامنٹ میں تیسرا مقام حاصل کیا۔ فی الحال انھوں نے شطرنج کو اپنا پیشہ بنالیا ہے۔ Lighting Chess کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

محمد رفیق خان:

بھوپال میں ۱۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں بھوپال میں میونسپل کارپوریشن سے منسلک ہیں۔ ہیڈ ماسٹر عبدالرحیم صاحب شطرنج کی بساط پر لانے کا واسطہ بنے۔

ریاستی سطح پر ۱۹۷۷ء میں ان کا نام ابھر کر سامنے آیا۔ ورلڈ چمپین بابی فشر کے کھیلوں سے بہت متاثر ہیں۔ ۱۹۷۶ء کے نیشنل چمپین شپ جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا، میں اپنے سحر انگیز کھیلوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے تماشائیوں سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ کلکتہ میں غیر مفتوح Unbeaten ہونے کا ریکارڈ بھی قائم کیا۔ اس وقت شطرنج سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کی زبان پر ایک ہی نام گونج رہا تھا۔ رفیق خان۔

عبدالجبار:

۱۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو کامپٹی، ناگپور، مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں اپنے والد سے شطرنج کا پہلا سبق لیا۔ معاش کے سلسلے میں ایک چھوٹے سے کاروبار سے منسلک ہیں۔

بچپن ہی سے شطرنج کھیلنے کی جانب طبیعت کا جھکاؤ تھا جو ۱۹۷۱ء میں ریاستی سطح پر ابھرنے کا سبب بنا۔
ورلڈ چمپین بابی فشر (Bobby Fischer) زیادہ پسند ہیں۔ مہاراشٹر اسٹیٹ چمپین شپ جو اورنگ آباد میں
ہوئی، میں لگا تا ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں پہلا مقام حاصل کیا۔ ۱۹۷۷ء میں وہ غیر مفتوح (Unbeaten) بھی رہے۔
زندگی کا واحد مقصد شطرنج کھیلنا اور اس میں نام پیدا کرنا ہے۔

ایک آل انڈیا مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال

آج جولائی کی پچیسویں تاریخ اور سال ۱۹۸۳ء ہے۔ رات کے دس بجنے والے ہیں۔ یہ کیا؟ آج تمام لوگوں کا رخ حمایت الغرباء ہائی اسکول کی جانب ہے۔ خوب یاد آیا۔ آج ہی کی رات تو بنگال اسپورٹنگ کلب کی جانب سے کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آئیے آج کی رات ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔

اسکول کے صحن میں بنا ہوا اسٹیج وقار اور سنجیدگی کا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہا ہے۔ لوگوں کا ایک اژدحام ہے۔ ہر طرح کے لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔ بوالہوس، اہل نظر، رقیبانِ روسیہ اور عاشقانِ باصفاسب موجود ہیں۔ آنے والوں کا ایک تانتا بندھا ہوا ہے۔ ہر شخص آگے کی نشست حاصل کرنے کے لیے بیتاب ہے اور بعضوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ کہاں تک سرکتے جائیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو

جائی ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں

ہر طرف شور و شرابے کا ماحول ہے۔ شاعروں کے تذکرے چھڑے ہوئے ہیں۔ بلند آوازوں میں تبصرہ ہو رہا ہے۔ بیکل اتساہی آگئے۔ بیکل صاحب نہیں آئے۔ صبا حیدر آبادی تشریف لا چکی ہیں۔ صبا صاحبہ نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ غرض طرح طرح کی باتیں ہیں۔

آئیے کچھ اور آگے بڑھتے ہیں سامنے اسٹیج کی جانب۔ یہ کیسی بھینی بھینی خوشبوؤں کی پلٹیں آرہی ہیں۔ بیلی کے پھولوں سے ساری فضا بسی ہوئی ہے۔ ٹیوب لائٹ سے محفل بقعہ نور بنی ہوئی ہے۔ اسٹیج پر حشم الرضوان بحیثیت صدرِ محفل جلوہ افروز ہیں۔ ان کے دائیں جانب جناب واقف رزاقی ہیں، کاکی نارہ کی متحرک سماجی شخصیت جو آج محفل کے مہمانِ خصوصی ہیں۔ بادی النظر میں مشاعرہ کا مہتمم بنگال اسپورٹنگ ہے مگر عام طور پر چرچا یہی ہے کہ مشاعرہ کے پس پشت تین آدمیوں کے ہاتھ کا فرما ہیں، وہ ہیں واقف رزاقی، حشم الرضوان اور معصوم شرقی۔

جناب واقف رزاقی کے بغل میں یہ کون ہے جو شاعر کے روایتی لباس شیروانی پائجامہ میں ملبوس پورے آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ ارے! یہی تو آج کی بزمِ شعرو سخن کے آفتابِ شمسِ مینائی ہیں جو بارہ بنکی سے تشریف لائے ہیں۔ آپ کی شخصیت اس جلسہ کو چار چاند لگا رہی ہے۔ صدرِ مشاعرہ کے بائیں جانب ناظمِ انصاری ہیں۔ ان کے بعد ثقلین حیدر ہیں جو آج کے مشاعرے کی نقابت کرنے والے ہیں۔ اور بھی چندے آفتاب و چندے ماہتاب جلوہ گر ہیں جن کی کرنیں آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہیں۔ کلکتے سے آئے ہوئے مہمانِ شعراء حبیب ہاشمی، رئیس آنولوی، شہود عالم آفاقی اور محترمہ ریحانہ نواب ہیں۔

بیرونی شعراء میں منظر بھوپالی، نظرا یٹوی، ہری کشور نظر ہیں۔ ان آفتاب و ماہتاب کے گرد ستاروں کی جگمگاہٹ بھی ہے جیسے معصوم شرقی، نور اقبال، سمیع اللہ قمر، صابر وارثی وغیرہ۔ دیدہ و دل کو فرش راہ کیے لوگ اپنے مہمانِ شعراء کو سننے کے لیے ہمدن گوش ہیں۔

اچانک اناؤنسر کی آواز گونجتی ہے۔ صدر مشاعرہ کی اجازت سے انھوں نے مشاعرے کا آغاز کر دیا ہے۔ ایک مقامی بزرگ شاعر سمیع اللہ قمر کا نام پکارا جا رہا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم نہایت ہی جذباتی انداز میں پڑھ کر محفل میں گرمی پیدا کر دی ہے۔ قمر صاحب کے بعد نور اقبال کو زحمت دی گئی ہے۔ نور صاحب مزدوروں کی بستی میں نظم ”مزدور“ لے کر اسٹیج پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اپنی آواز کے تاثر اور پڑھنے کے انداز سے انھوں نے محفل میں اک سماں باندھ دیا ہے۔ نظم ”مزدور“ بیحد پسند کی گئی ہے۔ واہ واہ کے شور سے پنڈال گونج اٹھا ہے۔ اب ثقلین حیدر نے ہری کشور نظر کے نام کا اعلان کیا ہے۔ نظر صاحب غزل سرا ہیں۔

زندگی حسن ہے ، یہ حسن نکھارے چلیے
چاندنی رات ہے دریا کے کنارے چلیے
نظر صاحب کا ترنم خوب ہے۔ ہر شعر پر دامل رہی ہے۔ اپنی آواز کا جادو جگاتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

کوئی طوفان اٹھاتا ہے زمانہ کیسے
ہم بھی دیکھیں تو ذرا ، ساتھ ہمارے چلیے
دادو تحسین کے نعروں سے فضا گونج اٹھی ہے۔ اور اب مدراس سے آئے ہوئے مہمان شاعر جناب وقار مانگ وقار مانگ پر موجود ہیں۔

یونہی جب کبھی میرا ذکر آگیا ہوگا
اس نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا ہوگا
آپ ہی کے کوچے میں اک وقار رہتا ہے
آپ نے نہ دیکھا ہو، نام تو سنا ہوگا
وقار صاحب کا ترنم خوب ہے۔ مشاعرہ کامیابی کی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ مانگ ایک بار پھر ثقلین حیدر کے ہاتھوں میں ہے۔ مشاعرے کا ٹمپو (TEMPO) اٹھانے میں ثقلین صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سچ پوچھیے تو مشاعرے کی کامیابی اناؤنسر پر ہی منحصر ہے اور ثقلین صاحب نے اس مشاعرہ کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اپنے چست فقرے، محل چٹکوں اور برجستہ اشعار سے سامعین کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

لیجیے منظر بھوپالی کے نام کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ منظر صاحب بھوپال سے تشریف لائے ہیں۔ کانکی نارہ کی سرزمین انھیں خوش آمدید کہتی ہے۔ منظر صاحب آسام اور مراد آباد کے خونیں واقعات کی منظر کشی کر رہے ہیں۔

بستر پہ فاختائیں تڑپتی ہی رہ گئیں
پر ظلم ڈھانے والے درندے نہ کم ہوئے
دو تین لاکھ لوگ ہی مارے گئے فقط
اب کے برس سنا ہے فسادات کم ہوئے
سارا سکون گاؤں کی بانہوں میں آگیا
شہروں کی قسمتوں میں فسادات رہ گئے
فضا ایک بار پھر دادو تحسین کے نعروں سے گونج اٹھی ہے۔ عوام کا اشتیاق دیکھتے ہوئے اناؤنسر نے انھیں ایک بار پھر

مانک پر لاکھڑا کیا ہے اور ان سے ان کی مشہور نظم ”میں کیسے گیت لکھوں؟“ پڑھنے کی فرمائش کی ہے۔ اس گیت کو سامعین نے بجد پسند کیا ہے۔ واقعی منظر صاحب نے تو کمال کر دیا ہے۔ اس کم عمری میں آواز کا یہ جادو۔ اللہ انھیں سلامت رکھے۔

مانک سے نظر ایٹوی کے نام کا اعلان ہو رہا ہے۔ نظر صاحب دہلی سے تشریف لائے ہیں۔ آواز بہت اچھی ہے۔ مطلع سے ہی انھوں نے سامعین کو موہ لیا ہے۔

تیرے لیے زحمت ہے میرے لیے نذرانہ
جگنو کی طرح آنا، خوشبو کی طرح جانا
واہ واہ، مکرر ارشاد کی پرشور آوازوں کے درمیان وہ اگلا شعر پڑھ رہے ہیں۔

ہم نے تو کتابوں میں کچھ پھول ہی رکھے تھے
دنیا نے بنا ڈالا کچھ اور ہی افسانہ

نظر ایٹوی کی آنکھوں پر کالا چشمہ ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے پھر بھی وہ ہمارے مشاعرے میں تشریف فرما ہیں۔

ثقلین صاحب نے اب منور رانا کو آواز دی ہے۔ منور صاحب شاعر بھی ہیں اور ایک کامیاب اناؤنسر بھی۔ بہر حال آج کی محفل میں وہ اپنا قطعہ (بلکہ تعارفی قطعہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا) پڑھ رہے ہیں۔

آرزو! دل پامال کی جانب آنا
آسمان! کبھی پاتال کی جانب آنا
کام ہے عشق مرا نام منور رانا
مجھ سے ملنا ہو تو بنگال کی جانب آنا

خاطر خواہ داد مل رہی ہے۔ رانا صاحب بھی موڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔ قطعات کی بھرمار کر دی ہے۔ شعر پڑھنے کا انداز منفرد ہے۔ تحت میں پڑھتے ہیں اور ترنم والوں کے چہرے فق کر دیتے ہیں۔

ستارے ، چاند ، کلیاں ، پھول ، پھلواری نہیں لاتے
غزل میں ہم کبھی بھرتی کی گلکاری نہیں لاتے
خوشامد ، چاپلوسی اور مکاری نہیں لاتے
ہم اپنے شعر میں الفاظ درباری نہیں لاتے

اور اب کلکتہ سے تشریف لائی ہوئی شاعرہ محترمہ ریحانہ نواب مانک پر موجود ہیں۔ شباب کے اس چلتے پھرتے جادو کی تصویر کشی سب کے بس کی بات نہیں۔ ذرا تپور ملاحظہ کیجیے۔

ہم نے سیکھا ہے کڑی دھوپ میں چلتے رہنا
تجھ سے اے زلفِ غزل دور کا رشتہ بھی نہیں

دادو تحسین کے نعروں سے احساسِ فتح مندی جاگ اٹھا ہے جواب تک خوابیدہ تھا جی تو خود اعتمادی کا یہ عالم ہے۔

گرچہ دشوار ہے ریحانہ اکیلے چلنا
لڑکھڑا جاؤں میں ایسا کوئی خدشہ بھی نہیں

اناؤنسر نے ناظم انصاری کے نام کا اعلان کر دیا ہے۔ سامعین کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ ناظم صاحب ناگپور سے تشریف لائے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے ذہن میں عزت مآب گورنر مغربی بنگال کی تصویر ابھر آتی ہے۔ ناظم صاحب نے پہلا شعر ہی داغ کر سامعین کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا ہے۔

دیوانہ اس نے کر دیا اک بار دیکھ کر
ہم کر سکے نہ کچھ بھی لگاتار دیکھ کر
ان کے ان اشعار پر سامعین لوٹ پوٹ ہو گئے ہیں۔

میں تیرے ساتھ ترے باپ کو بھی خوش رکھوں
مری بساط سے باہر دکھائی دیتا ہے
جتن ہزار کیے جا کے تب چڑھی ہنڈیا
حرام خوروں کو لنگر دکھائی دیتا ہے
ناظم انصاری سامعین کا موڈ دیکھ کر خود بھی موڈ میں آ گئے ہیں اور ترنم کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔

شیخ جی فیشن کی رو میں بہہ گئے
ہم پھٹچر کے پھٹچر رہ گئے

اتنا شور و غل اتنا ہنگامہ ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ پبلک نے ناظم صاحب کو بھید پسند کیا ہے۔ اناؤنسر کی فرمائشوں پر وہ اپنی نظم ”ٹانگ اڑایا مت کر“ پڑھ رہے ہیں اور خوب داد وصول کر رہے ہیں۔ ”پڑھتے وقت وہ لفظ ٹانگ کو اتنا کھینچ رہے ہیں کہ لوگ بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔

اب ٹانگ سے رئیس آنولوی کے نام کا اعلان ہو رہا ہے۔ رئیس صاحب کلکتہ سے تشریف لائے ہیں۔ قلم میں دھار بھی ہے اور اپنے ترنم کے لیے بھی خاصے مشہور ہیں۔ قطعہ سے انھوں نے آغاز کیا ہے۔

نہ تغافل نہ تجاہل کا اثر ہوتا ہے
تم جدھر ہوتے ہو رخ سب کا ادھر ہوتا ہے
تیغ ہوتی ہے ، لہو ہوتا ہے ، سر ہوتا ہے
یہ تماشہ تو یہاں شام و سحر ہوتا ہے
دادو تحسین کے شور میں رئیس آنولوی شعر پڑھ رہے ہیں۔

تم مری دشت نوردی پہ تعجب نہ کرو
راس آجائے تو ویرانہ بھی گھر ہوتا ہے
منزل دار کو انجام تک و دو نہ سمجھ
منزل دار سے آغاز سفر ہوتا ہے

پورا پنڈال واہ واہ کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ ثقلین صاحب حبیب ہاشمی کو آواز دے رہے ہیں۔ ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ نوجوانوں میں ہلچل سی مچ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے حبیب ہاشمی کے دیوانے بہت ہیں۔

اے کاسہ مظلومی ٹکرا جا چٹانوں سے
انصاف نہیں ہوگا ، پتھر کا زمانہ ہے
ایک بار پھر مشاعرہ میں گرمی پیدا ہوگئی ہے اور حبیب صاحب دوسری غزل کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔

پہرہ یزیدیوں کا ہے نہر حیات پر
سوکھے ہوئے ہیں ہونٹ قیامت کی پیاس ہے
رہیے حبیب دور امیران شہر سے
ان کی طبیعتوں میں خدائی کی باس ہے

رات کے دوج رہے ہیں۔ مشاعرہ اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے۔ اتنی خاموشی اور اتنے سکون کے ساتھ سامعین حضرات اپنی جگہ پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ مشاعر کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ اس کامیاب مشاعرے کے کامیاب اناؤنسر نے شہود عالم آفاقی کے نام کا اعلان کیا ہے۔ شہود صاحب اپنے بھاری بھر کم جسم اور اس سے بھی زیادہ بھاری آواز کے ساتھ مانک پر موجود ہیں۔ سامعین کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی ہے۔ شہود صاحب کی ذات سے بہت سارے لطائف وابستہ ہیں۔ یہ وقت ان کے لطائف بیان کرنے کا نہیں، ان کے کلام سے محفوظ ہونے کا ہے۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

کون گزرا ہے ابھی رات کی تاریکی میں
چاندنی کھیل رہی ہے مرے بام و در سے
سامعین سردھن رہے ہیں۔ تعریف کے ڈونگرے برسا رہے ہیں اور شہود صاحب اپنی دھن میں مگن ہیں۔
کچی دیواریں زمیں بوس نہ ہو جائیں کہیں
بھگے بادل سے کہو گاؤں کے باہر برسے
شہود صاحب کے بعد شورش فیض آبادی مانک پر ہیں۔

موجوں کے تھپڑے میں جو شخص پلا ہوگا
اس شخص کے جینے کا انداز جدا ہوگا
غزل کے اس شعر پر انھیں اتنی دابل رہی ہے کہ بس پوچھیے مت۔
وہ بات کبھی تو نے جو چپکے سے کہی تھی
اس بات کا احساس دلانے کے لیے آ

اور اب مانک سے جس نام کا اعلان ہو رہا ہے، وہ آج کی محفل کے خاص مہمان شمشی مینائی ہیں جو بارہ بنکی سے تشریف لائے ہیں۔ شمشی مینائی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ سفید چوڑی دار پائجامہ، روایتی کالی شیروانی، سر پر ٹوپی، کیا آن بان ہے۔ ہلکے قدموں سے وہ مانک کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ محفل میں اس کنارے سے اس کنارے تک خاموشی چھا گئی ہے۔ شمشی صاحب مائیک پر کھڑے ہیں اور ان کا وجود پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

قطعہ سے انھوں نے اپنے کلام کا آغاز کیا ہے۔

گاندھی بدن کا نام نہیں ہے اصول کا
 گاندھی کے ہر اصول کو ٹھکرا دیا گیا
 گاندھی کا قتل عام سبھا میں نہیں ہوا
 گاندھی کا قتل لوک سبھا میں کیا گیا

خوب داد مل رہی ہے۔ مینائی صاحب کے پڑھنے کا انداز بھی دلکش ہے۔ ایک قطعہ کے بعد دوسرا قطعہ، ایک شعر کے بعد دوسرا شعر، گویا ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا ہے۔ شمشی صاحب کی اس نظم کو تو بیحد سراہا جا رہا ہے جس کے بول ہیں۔

سب کچھ ہے اپنے دلش میں روٹی نہیں تو کیا
 جناب شمشی مینائی کے بیٹھے ہی ایک ناقابل بیان کیفیت چھا جاتی ہے۔ ہر شخص مبہوت اور بے خود بیٹھا ہے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ بس ایک خیال رہ گیا ہے، باقی سب کچھ وہم و گمان بن چکا ہے۔ سامنے صرف ایک ہی حقیقت ہے جس کو آپ نے، ہم نے، سبھوں نے محسوس کیا ہے اور وہ ہے آج کا مشاعرہ کامیاب ہے، بے حد کامیاب۔
 پس نوشت:- کچھ شعراء کے اشعار قلمبند نہیں کیے جاسکے جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مغربی بنگال کا پہلا طرچی مزاحیہ مشاعرہ

دنیا میں جہاں کہیں بھی اردو جاننے والے افراد آباد ہیں وہاں مشاعروں کا انعقاد ناگزیر ہے۔ ماضی میں دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، رامپور، مرشدآباد اور کلکتہ وغیرہ کو اردو کے مرکز کی حیثیت سے شہرت بھی مل چکی ہے۔

مغربی بنگال میں اردو زبان کی ترویج و ترقی میں فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء کا اہم کردار رہا ہے۔ اس زمانے میں کلکتہ اور مرشدآباد اردو کے اہم مراکز تھے۔ مشاعرے تو بہت ہوئے لیکن ۲۵ جولائی ۱۹۱۲ء کا مشاعرہ کلکتہ کا ہی نہیں ہندوستان کا بھی اولین مشاعرہ ہے جس میں پڑھی گئی غزلوں کی تفصیل سے اردو دنیا واقف ہے۔ اس مشاعرے کا ذکر بینی نرائن جہاں کی کتاب ”دیوانِ جہاں“ میں ملتا ہے۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے بھی اپنی کتاب ”کلکتہ میں اردو کا پہلا مشاعرہ“ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ طرچی مشاعرہ ضرور تھا لیکن مزاحیہ نہیں۔

۱۹۷۳ء میں مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے ڈاکٹر خلیق انجم اور سمجد راجوشی کے رسالے ”سیکولر ڈیموکریسی“ کے تعاون سے لال قلعہ، دہلی کے میدان میں ایک آل انڈیا مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد کیا تھا جسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ایک مزاحیہ مشاعرہ تھا، طرچی نہیں۔

اردو کی بستیاں ہندوستان کے جس صوبے میں بھی موجود ہیں وہاں اکثر و بیشتر طرچی مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ کانکی نارہ (ضلع چوہیس پرگنہ، مغربی بنگال) کی سرزمین پر بھی پہلا طرچی مشاعرہ ۳ مئی ۱۹۴۱ء کو منبوسر دار کے محلہ میں ماسٹر مظہر الحق کی صدارت میں ہوا تھا جس کی طرح تھی۔

قاتل پکارتا ہے کہ قاتل نہیں ہوں میں

اس مشاعرے میں کانکی نارہ و مضافات کے علاوہ کلکتہ و ہوڑہ کے شعراء حضرات نے بھی حصہ لیا تھا۔ وحید عرشی (مرحوم) نے اس مشاعرے کا ذکر ”غزل کی رات“ نامی مجلہ میں تفصیل سے کیا تھا۔ یہ مشاعرہ بھی طرچی تھا، مزاحیہ نہیں۔

اس پس منظر میں یکم نومبر ۱۹۸۷ء کو ہونے والا طرچی مشاعرہ نہ صرف کانکی نارہ اور جکندل بلکہ بنگال کا پہلا طرچی مزاحیہ مشاعرہ قرار پائے گا جو کلی طور پر مزاحیہ تھا لہذا مناسب ہوگا کہ بنگال کے اولین طرچی مزاحیہ مشاعرے کی تفصیل سے اردو دنیا واقف ہو۔ یہ خاکسار بذاتِ خود اس مشاعرے میں شریک تھا اس لیے ذہن کے صفحات پر جو اشعار رقم ہیں، وہ اہل ادب کی دل چسپی کے لیے پیش خدمت ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ مصرع طرح کا انتخاب معروف شاعر انشاء اللہ خاں انشاء کی غزل سے کیا گیا تھا۔

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوچھی

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ مغربی بنگال کے ایک مشہور استاد شاعر حشم الرضمان کو جب اس طرچی مزاحیہ مشاعرے کی دعوت دی گئی تو انھوں نے بے ساختہ کہا کہ ان لڑکوں کو یہ بھی پتہ نہیں کہ غزل کا سنجیدہ شاعر بھلا ہزل کیونکر کہہ سکے گا۔ کیا دلیپ کمار جانی واکر کی اداکاری کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ منتظمین مشاعرہ کے اصرار پر حشم الرضمان نے زندگی

میں پہلی بار ہزل کہی اور شاید آخری بھی۔ آخر آخر تک مدعوئین شعراء میں بے چینی تھی۔ کسی نے دو شعر تو کسی نے تین شعر نکالے تھے۔ کچھ شعراء نے سیون اسٹار لائبریری کے صدر قیوم بدر سے گزارش بھی کی کہ تمام شعراء سنجیدہ ہیں لہذا ہزل کی پابندی اٹھالی جائے۔ بلکہ یہ رعایت رکھی جائے کہ ہزل نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنا دوسرا کلام پڑھ لیں لیکن انھوں نے رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ بھلے ہی مشاعرہ ناکام ہو جائے، رعایت ممکن نہیں۔ یقیناً قیوم بدر نے ایک بڑا رسک لے لیا تھا۔

وقتِ معینہ پر مشاعرہ شروع ہوا اور نہایت ہی کامیابی کے ساتھ چار گھنٹے تک چلتا رہا۔ سامعین آخر دم تک محفل میں جیسے رہے اور مشاعرہ ختم ہونے کے بعد اراکین لائبریری کو مبارک باد بھی پیش کی۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہیں ہوگا کہ مشاعرے سے قبل شعراء حضرات کی ضیافت طبع کے لیے جس ناشتے کا اہتمام کیا گیا تھا، وہ بھی قافیہ کی مناسبت سے تھا۔ مہمان شعراء کے سامنے جب انگور، منصور (مٹھائی)، کھجور اور چنا چور رکھے گئے تو وہ بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔ مہمان خصوصی اور نقیب مشاعرہ کا انتخاب کرنے میں بھی قافیہ کا التزام ملحوظ خاطر تھا مثلاً پروفیسر منصور (موجودہ پبلک سروس کمیشن کے رکن ڈاکٹر منصور عالم) اور نقیب نور (معروف شاعر نور اقبال)۔ صدارت کے لیے مشہور ہزل گورگھونا تھ گستاخ کو دعوت دی گئی تھی۔ گرچہ یہ نام قافیہ کی مناسبت سے میل نہیں کھاتا تھا پھر بھی اراکین لائبریری نے نام کے پہلے حصے کو الٹ کر (یعنی رگھو سے گھور) اپنی تسلی کر لی تھی۔

خیر صاحب مشاعرہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے غلام محمود صدیقی نے ہزل پڑھی۔ جو اراکین لائبریری کی اجتماعی ہزل تھی۔ شعر حاضر ہیں۔

ہم قافیہ نسبت ہو نقابت سے بھی یارو
ثقلین کے بدلے میں ہمیں نور کی سو جھی

ابھرتے ہوئے شاعر بلند اقبال نے کہا۔

نزدیک کی سو جھی تو کبھی دور کی سو جھی
ہر لمحہ مجھے ایک نئے ٹور کی سو جھی
جواں سال شاعر احمد کمال حشمی نے جب تضمین کا شعر پڑھا تو پنڈال داد تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا۔

اگوے سے کہا، لنگڑی بھی مل جائے تو بہتر
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سو جھی
جب مرغ و مسلم نے کیا ہاضمہ گڑ بڑ
تب مولوی کو سنگھی و ماگور کی سو جھی

واضح رہے احمد کمال حشمی ”آیاتِ سخن“ کے مرتب بھی ہیں جس میں مضافات کے تقریباً ۴۳ شعراء کا تذکرہ موجود ہے۔ حال ہی میں ان کی غزلوں کا مجموعہ ”سفرِ مقدر ہے“ شائع ہوا ہے۔ مغربی بنگال کے اردو ادب میں نئی نسل کے اس شاعر سے بہت ساری توقعات وابستہ ہیں۔

یونس اثر بھی کامیاب رہے

داڑھی کو چھپائے ہوئے مفلر میں ملے کل

واعظ کو بھی جب دختر انگور کی سو جھی
مصروف عبادت ہیں میاں شیخ مگر کیوں
اس عمر ضعیفی میں انھیں حور کی سو جھی
خاکسار زماں قاسمی کی ہزل کا مطلع اور ایک شعریوں ہے۔

بس بیٹھے بٹھائے ہمیں جب ٹور کی سو جھی
کشمیر کی ، اجمیر کی ، جے پور کی سو جھی
پکنک کے لیے یوں تو تھے اسپاٹ بہت سے
خواہش تھی مدھو کی تو مدھو پور کی سو جھی
خاکسار کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ”ریت اڑتی رہی“ کے نام سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔
اب نورا قبال (نقیب مشاعرہ) کی باری تھی۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ”میری آواز سنو“ کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔
تنخواہ کے دن اس کو بڑی دور کی سو جھی
تاڑی کی جگہ دختر انگور کی سو جھی
وہ ڈھونڈتا ہے اپنے لیے چاند سی دلہن
لنگور نما دولھے کو بھی حور کی سو جھی
کانکی نارہ کی ایک متحرک ادبی و سماجی شخصیت واقف رزاقی کو دعوتِ سخن دی گئی۔ انھوں نے حقیقت بیانی سے کام لیا

اور بید کا میاب رہے۔

لیڈر کا ہی دھندہ کبھی ہوتا نہیں مندا
مالک سے جو ان بن ہوئی ، مزدور کی سو جھی
اب باری آئی استاد شاعر حشم الرضوان کی۔ انھوں نے نہایت کامیاب ہزل کہی تھی۔ قارئی کے ذوقِ طبع کے لیے دو
اشعار پیش خدمت ہیں

بچوں سے فراغت تھی تو نکلیں نہ یہ گھر سے
کچ بچ ہوئے بچے تو انھیں ٹور کی سو جھی
بالوں میں سیاہی تھی تو بنتی تھیں کنواری
چاندی ہوئے جب بال تو سیندور کی سو جھی

حشم الرضوان صاحب کی ہزل ان کے اعلیٰ ذوق اور حس مزاح کی غماز تھی۔ ان کی نظموں و گیتوں کا مجموعہ ”میری
نظمیں میرے گیت“ ۲۰۰۰ء میں اور تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ”قلم بولتا ہے“ ۲۰۰۱ء میں چھپ کر خاص و عام سے داد و
تحسین وصول کر چکا ہے۔

تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں لیکن لوگوں کے دلوں میں آج بھی اس طرحی مزاحیہ مشاعرے کی کھٹی میٹھی یادیں
موجود ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۸۷ء کی یہ قہقہہ زار شام آج بھی لوگوں کے دلوں میں روشن ہے۔ اکثر نئی محفلوں میں اس کا تذکرہ چلتا

رہتا ہے۔

برسبیل تذکرہ اس طرح کے مشاعروں کے لیے حیدرآباد کی سرزمین بھی کافی زرخیز رہی ہے۔ ”زندہ دلان حیدرآباد“ کے نام سے وہاں ایک ادبی تنظیم قائم ہے جو اکثر و بیشتر مزاحیہ مشاعروں کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہاں بھی کسی طرحی مزاحیہ مشاعرے کا ذکر نہیں ملتا۔ ”انجمن زندہ دلان حیدرآباد“ کا شائع کردہ میگزین ”شگوفہ“ بھی اس سلسلے میں خاموش ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس مشاعرے میں مغربی بنگال کے دوسرے مشاہیر شعراء کرام مدعو نہیں تھے تاہم یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا مشاعرہ تھا۔ مزاحیہ بھی اور طرحی بھی لہذا اس کا تذکرہ قارئین کے ذوقِ طبع پر بار نہ ہوگا اور محققین کے لیے وسیلہ تحقیق کا سبب بنے گا۔

حواشی

- بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء
 خم خانہ کبیر مع پیمانہ کبیر
 ریت اڑتی رہی
 یادوں کا زنداں
 صدائے اعطش
 آیات سخن
 دستک ۵ (ہوڑہ)
 حاصل مطالعہ
 کائنات
 بھنور (ناول)
 نئی زندگی (ناول)
 دخل در معقولات
 کائنات (پرنٹ ایڈیشن)
 بنیادی تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت
 دست خط
 مرثاں
 مرثاں
 مرثاں
 شاعر
 غزل کی رات (مجلہ)
 صدائے احباب (مجلہ)
- مشتاق احمد۔ مارچ ۱۹۷۲ء
 مرتب ڈاکٹر ایم کے پیری پٹنہ
 زماں قاسمی۔ ۲۰۰۱ء
 مرتب کمال جعفری۔ ۱۹۹۱ء
 مرتبین: زار غازی پوری، ارمان شام نگری۔ ۱۹۷۶ء
 مرتبین: احمد کمال خٹمی، افضل عاقل۔ ۱۹۹۵ء
 ایڈیٹر: عنبر شمیم
 حیدر قریشی (جرمنی)۔ ۲۰۰۸ء
 ایڈیٹر: خورشید اقبال۔ مئی ۲۰۰۴ء
 مصنف: بشیر الدین غامی۔ ۱۹۷۵ء
 مصنف: بشیر الدین غامی۔ ۱۹۷۸ء
 مصنف: قیوم بدر۔ ۱۹۹۷ء
 چیف ایڈیٹر: خورشید اقبال۔ جنوری ۲۰۰۴ء
 محمد علی صدیقی
 ایڈیٹر: اختر بارکپوری۔ مئی ۲۰۰۰ء
 ایڈیٹر: نوشا دمومن۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء
 ایڈیٹر: نوشا دمومن۔ جنوری ۲۰۰۰ء
 ایڈیٹر: نوشا دمومن۔ سالگرہ شمارہ ۲۰۰۴ء
 ایڈیٹر: افتخار امام صدیقی۔ ۲۰۰۸ء
 مرتبین: وحید عرشی، وفا سکندر پوری، بشیر الدین
 ایڈیٹر: مختار الحق مختار۔ ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر: ممتاز انور۔ ۱۹۸۵ء	آئینہ (مجلہ)
ایڈیٹر: محمد ناصر انصاری۔ ۱۹۸۷ء	لمعات (مجلہ)
ایڈیٹر: قیوم بدر۔ ۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۷ء	صدف (مجلہ)
ایڈیٹر مشتاق احمد۔ جلد ۱۱، شمارہ ۱۱	سمط (کلکتہ)
مرتب: شہود عالم آفاقی	اختر ثاقب
اسکول میگزین حمایت الغرباء ہائی اسکول۔ ۱۹۶۸ء	کرن
ایڈیٹر: ۱۹۸۶ء	الہلال (مجلہ)
نصر غزالی۔ ۱۹۸۲ء	لہو کا درد (شعری مجموعہ)
منظفر حنفی۔ ۱۹۹۶ء	یا انی (شعری مجموعہ)
جلد ۶، شمارہ ۱۔ اپریل۔ جون ۱۹۸۰ء	سائنس کی دنیا
مرتبین: شاہد ساز، امتیاز احمد۔ ۲۰۰۵ء	مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب
رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو
محمد حسین آزاد	آب حیات
ضیا احمد ضیاء	دیوان مومن
تمکین کاظمی	مومن
جنوری ۱۹۷۵ء	اردو ڈائجسٹ
اکتوبر ۱۹۹۱ء	آج کل (دہلی)
مارچ ۱۹۹۸ء	آج کل (دہلی)
۱۰ فروری ۱۹۹۲ء	راشٹریہ سہارا
۳ دسمبر ۲۰۰۲ء	آزاد ہند کلکتہ
الف انصاری	شعرائے بنگالہ حصہ اول
۳۱ اکتوبر ۱۹۵۷ء	عصر جدید (کلکتہ)
۶ فروری ۱۹۸۵ء	اخبار مشرق (کلکتہ)
یکم دسمبر ۱۹۸۱ء	بخشیات (پندرہ روزہ) کلکتہ
جون ۱۹۷۹ء	یا ترک (بنگلہ) مجلہ
(R. L. Mitchel) آر۔ ایل میچل	How To Play Chess
ایڈیٹر: سی۔ کے۔ شکیل (C. K. Shukul)	Three Ways Of Chess
نور اقبال۔ ۱۹۹۵ء	میری آواز سنو
قیوم بدر۔ ۱۹۹۷ء	دخل در معقولات

احمد کمال ششی۔ ۲۰۰۵ء
قیوم بدر۔ ۲۰۰۶ء
ظہیر احمد صدیقی
امریکہ۔ ایڈیٹر: قمر نقاش بندی
دسمبر ۱۹۸۸ء

سفر مقدر ہے
ہم قبرستان سے بول رہے ہیں
مومن خاں مومن
روشنی (ماہنامہ)
جرائم (نئی دہلی)

اردو دوست لائبریری

اردو دوست ڈاٹ کوم
www.urdudost.com

یہ کتاب اپنے کسی دوست یا رشتے دار کو
ای میل کیجئے